سہ ماہی

صالحات

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

جلد: 1 شمارہ: 4 اپریل - جون 2025ء

علم و آگہی اور شعور و تربیت

"آج کے دور میں اگر کسی قوم نے ایک سوپر پاور پر اپنی برتری دکھانی ہو تو اسے ثابت کرنا ہو گا کہ اس کے پاس اس سے زیادہ جدید ٹکنالوجی، زیادہ طاقتور فوج اور زیادہ طاقت ور کرنسی ہے۔ ایک سوپر پاور کا صدر اگر مقابلے کے کسی ایسے ملک کا دورہ کرے گا تو اس کے ساتھ فلسفیانہ مباحث، تبلیغی گفتگو اور علمی محاضرات نہیں کیے جائیں گے بلکہ اس کو دکھایا جائے گا ہمارے پاس ایسی قوتیں، ایسی صنعتیں، ایسی ایجادات و اختراعات ہیں جن کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ اور اگر یہ مقابلہ جنگ کے بغیر جیتنا ہو تو وہی کچھ کرنا ہو گا جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے مقابلے میں کیا تھا۔ انھوں نے ملکہ کو، اللہ کے کرم اور عنایت سے، اپنے مقابلے میں دیہاتی اور بہت کمزور ثابت کر دیا تھا۔"

(ملکہ سبا: ایک عظیم حکمران)

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

علم و آگہی اور شعور و تربیت

سہ ماہی

صالحات

خواتین کے لیے

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

نگران: حسن الیاس

جلد: 1 شمارہ: 4 اپریل - جون 2025ء

مدیر: نعیم احمد بلوچ

نائب مدیر: وجیہہ حسان واحدی

مجلس ادارت

ارم نبی، بینش سلیم، ثوبیہ نورین، غزل چودھری ، نکہت ستار

مجلس مشاورت

کوکب شہزاد، منیزہ ہاشمی، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر عظمیٰ عثمان ، نسرین آفتاب

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

سہ ماہی
صالحات
خواتین کے لیے

علم و آگہی اور شعور و تربیت

زیرِ سرپرستی
جاوید احمد غامدی
نگران: حسن الیاس

فہرست مضامین

1۔ تعدد ازواج اور قرآن کی اجازت	استاد جاوید احمد غامدی	04
2۔ زبردستی کی شادیاں	ڈاکٹر شہزاد سلیم	06
3۔ گلوبل ویلیج میں رہنے کا مسئلہ	نعیم احمد بلوچ	09
4۔ ایک تاریخی خط	مولانا امین احسن اصلاحی	13
5۔ زیورات پر زکوٰۃ: دین کا حکم کیا ہے؟	محمد حسن الیاس	15
6۔ انوکھی معافی	نور الہدیٰ شاہ	20
7۔ ملکہ سبا: دور سلیمان علیہ السلام کی عظیم حکمران	نعیم احمد بلوچ	25
8۔ کوڈنگ اور ڈیجیٹل اسکلز کے ذریعے امکانات کو کھولیے	وجیہہ حسان واحدی	34
9۔ زندگی، آزمائش اور حقیقی سکون	کلثوم ثاقب	40
10۔ اکیبانہ: ایک قدیم روحانی فن!	ڈاکٹر سیمین معین الدین/ وجیہہ حسان واحدی	44
11۔ لاپتہ جینڈر	اقصٰی گیلانی	48
12۔ کیا ہم زندہ ہیں	وجیہہ حسان واحدی	51
13۔ تن من نیل و نیل	احتشام نبی	54
14۔ نامے جو میرے نام آئے!	وجیہہ حسان واحدی	58

استاذ جاوید احمد غامدی

تعدد ازواج اور قرآن کی اجازت

وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ
كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ﴿۲﴾ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ
مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا
تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا
مَّرِیْٓـًٔا ﴿۴﴾

ترجمہ

(اللہ سے ڈرو) اور یتیموں کے مال ان کے حوالے کر دو اور ان کے لیے ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے نہ بدلو اور نہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھاؤ۔ اس لیے کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر اندیشہ ہو کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے ساتھ جو عورتیں ہیں، ان میں سے جو تمھارے لیے موزوں ہوں، ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ پھر اگر ڈر ہو کہ ان کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو (اس طرح کی صورت حال میں بھی) ایک ہی بیوی رکھو یا پھر لونڈیاں جو تمھارے قبضے میں ہوں۔ یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم بے انصافی سے بچے رہو۔ اور ان عورتوں کو بھی ان کے مہر دو مہر کے طریقے سے۔ اگر وہ اس میں سے تمھارے لیے اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دے تو اس کو البتہ تم مزے سے کھا سکتے ہو۔

تفسیر

ان آیات میں ایک سے زیادہ شادیوں، لونڈیوں کے ساتھ تعلق، غلاموں کے مسئلے اور مہر میں رعایت کے موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس نشست میں ایک سے زیادہ شادیوں یعنی تعدد ازواج (پلیگی) کے بارے میں جاوید احمد غامدی کے رائے کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

اصلِ نکاح کا اصول:

قرآن کی رو سے نکاح کا اصلِ اصول ایک ہی بیوی رکھنا ہے، جیسا کہ سورہ نساء (4:3) میں ذکر ہے۔

استثنائی صورت:

دوسری شادی کی اجازت صرف بعض مخصوص حالات میں دی گئی ہے، جیسے یتیموں اور بیواؤں کی کفالت یا کسی اور سماجی ضرورت کے تحت۔ یعنی محبت، جنسی ضرورت وغیرہ سے اس کی اجازت نہیں مل سکتی۔

عدل کی شرط:

قرآن نے واضح کیا ہے کہ اگر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں عدل نہیں کر سکتے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا لازم ہے (النساء 4:3)۔

انسانی فطرت اور عدل:

غامدی صاحب کی رائے میں، عدل کرنا تقریباً ناممکن ہے، جیسا کہ سورہ نساء (4:129) میں اللہ نے خود فرمایا ہے کہ تم ہرگز بیویوں کے درمیان پورا عدل نہیں کر سکتے۔ اس لیے ایک سے زیادہ شادیوں کا جواز عملی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی متعدد شادیاں:

غامدی صاحب بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی متعدد شادیوں کے پس پردہ سماجی، سیاسی اور فلاحی عوامل تھے اور وہ عام مسلمانوں کے لیے مثال نہیں ہیں۔

نتیجہ

غامدی صاحب کے نزدیک، ایک مرد کے لیے ایک ہی نکاح کافی ہے اور یہی قرآن کا عمومی حکم ہے۔ دوسری شادی کی اجازت ایک استثنائی صورت کے طور پر دی گئی ہے، جو مخصوص حالات میں اور عدل کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔

تلخیص و تسہیل: نعیم بلوچ

تعلیم الحدیث

ڈاکٹر شہزاد سلیم

زبردستی کی شادیاں

عَنْ أَبِی ہُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تُنْکَحُ الْبِکْرُ حَتّٰی تُسْتَأْذَنَ وَلاَ الثَّیِّبُ حَتّٰی تُسْتَأْمَرَ، فَقِیلَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ إِذْنُھَا؟ قَالَ: إِذَا سَکَتَتْ۔(بخاری، رقم ٦٥٦٧)

ترجمہ

”حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کنواری کی شادی نہ کرو جب تک اس سے اجازت نہ لی جائے اور بیوہ کی شادی نہ کرو جب تک اس سے مشورہ نہ کر لو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ، کنواری سے اجازت کیسے لی جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب وہ (تمھارے پوچھنے پر) خاموش رہے۔“

تشریح

بہت سے معاشروں میں جہاں جاگیردارانہ نظام موجود ہے، وہاں لوگ اپنی بیٹی اور بہن کی بعض اوقات زبردستی شادی کر دیتے ہیں جو کہ یقیناً اس آزادی رائے اور حق کے خلاف بات ہے جو اسلام خواتین کو اپنا شریک حیات چننے کے لیے دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے:

عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْأَيِّمُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا وَالْبِكْرُ تُسْتَأْذَنُ فِيْ نَفْسِهَا. (مسلم، رقم ۱۴۲۱)

”حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیوہ اپنے ولی کی نسبت خود اپنا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور کنواری سے اجازت لی جائے گی۔“

اس طرح کی زبردستی کی شادیاں اسلام کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں اور اگر دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کو بھی ناپسند ہو تو انھیں ختم کیا جاسکتا ہے:

عَنْ خَنْسَاءَ بِنْتِ خِذَامٍ الْأَنْصَارِيَّةِ أَنَّ أَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ ثَيِّبٌ فَكَرِهَتْ ذٰلِكَ فَأَتَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَدَّ نِكَاحَهُ. (بخاری، رقم ۴۸۴۵)

ترجمہ:

”حضرت خنساء بنت خذام انصاریہ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کی شادی کردی، جبکہ وہ بیوہ تھیں، خنساء کو یہ شادی پسند نہیں تھی۔ لہٰذا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی (اور پورا واقعہ بیان کیا)۔ آپ نے اس کا نکاح ختم کردیا۔“

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شادی میں ماں باپ اور ولی کی مرضی ہونا ضروری ہے؟ ہمارے معاشرے میں جب سے کچھ شادیاں ماں باپ اور ولی کی مرضی کے بغیر ہونے لگی ہیں، یہ سوال بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

اس ضمن میں قرآن مجید کے مطابق شادی میں ماں باپ اور ولی کی اجازت کوئی قانونی تقاضا نہیں ہے۔ شادی کے لیے قانونی تقاضے صرف دو ہیں: پہلا یہ ہے کہ دونوں پاک دامن ہوں اور دوسرا یہ کہ مرد پر یہ لازم ہے کہ بیوی کو اس کا مہر دے۔ تاہم ماں باپ اور ولی کی شادی میں رضامندی سماجی اور معاشرتی ضرورت ہے۔ 'لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ' (کوئی شادی ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہونی چاہیے) اور اس طرح کی دوسری روایات اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

یہ حکم خاندان کے ادارے کے لیے اسلام کی معاشرتی ہدایات پر مبنی ہے اور اس میں یقیناً حکمت پائی جاتی ہے۔ اسلام کے نزدیک خاندان کے تحفظ اور بقا کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے یہ بالکل فطری ہے کہ شادی ماں باپ کی مرضی سے ہونی چاہیے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ شادی جو والدین کی رضامندی کے ساتھ ہوتی ہے، اس سے نئے وجود میں آنے والے خاندان کو تحفظ اور سہارا ملتا ہے۔

تاہم یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس عام اصول میں ہمیشہ ایک استثنا ہو سکتا ہے۔ اگر شادی کرنے والے مرد اور عورت یہ سمجھتے ہیں کہ شائستگی سے قائل کرنے کی پوری کوشش کے باوجود ماں باپ کی طرف سے شادی پر رضامند نہ ہونے کے پیچھے کوئی ٹھوس وجہ نہیں یا کسی وجہ سے والدین اس ملاپ کی بنیادوں کو نہیں سمجھ پا رہے تو پھر شادی کرنے والے مرد و عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ اس بندھن میں بندھ جائیں، وہ معاملات عدالت میں لے جائیں۔ اب یہ عدالت پر منحصر ہے کہ وہ پورے معاملے کا جائزہ لے۔ اگر وہ مرد اور عورت کے موقف سے مطمئن ہے تو وہ انھیں شادی کی اجازت دے سکتی ہے۔ اس صورت میں جیسے کہ ایک حدیث ۳۲ سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست کو اس جوڑے کا ولی تصور کیا جائے گا۔ دوسری صورت میں اگر عدالت یہ سمجھتی ہے کہ ماں باپ کا اعتراض بالکل صحیح ہے تو وہ دونوں فریقوں کو اس بندھن کو باندھنے سے روک سکتی ہے۔ البتہ کوئی عدالت ماں باپ اور ولی کی مرضی کے بغیر کی گئی شادی کو منسوخ قرار نہیں دے سکتی۔

نعیم احمد بلوچ

گلوبل ویلیج میں رہنے کا مسئلہ

معاشرے بگڑتے اور سنورتے رہتے ہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے اور اسی لیے ہجرتیں ایک عالم گیر مظہر ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جب یاجوج ماجوج دنیا کے تمام پھاٹکوں پر حتمی طور پر قابض ہوگئے تو سب سے زیادہ متاثر وہ قومیں ہوئیں جو نوآبادیات رہ چکی تھیں۔ دنیا کے نقشے پر ابھرنے والے ان ممالک میں جن قوموں کو اچھی قیادت ملی، انھوں نے اپنی ترقی کا سفر جلد شروع کر دیا لیکن بعض ملکوں میں بدقسمتی سے اچھی قیادت کا بحران رہا۔ ان ممالک کے لوگ جب عدم تحفظ کا شکار ہوئے تو بہتر مستقبل کی خاطر ان میں ہجرتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ بالکل فطری عمل تھا۔ جب سے دنیا آباد ہے، انسان بہتری کی خاطر ہجرتیں کرتا آیا ہے۔

برصغیر میں قیادت کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے مسائل زیادہ تھے۔ اس وجہ سے یہاں سے رخت سفر باندھنے والوں کی تعداد باقی ممالک سے زیادہ تھی۔ اور حالات و واقعات بھی کچھ ایسے ہوئے کہ پاکستان، ہندستان اور بنگلہ دیش سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو زیادہ تر غیر مسلم ممالک میں مستقل قیام کے بہتر مواقع ملے۔ اس کی وجہ یہاں کی انسان دوست معاشرت اور ویلفیئر اسٹیٹ ماڈل تھا۔ ان میں سے بعض تارکین وطن ایسے ہیں جنھیں شناخت کے مسئلے سے دوچار ہونا پڑا۔

جن مسلم خاندانوں کو یہ مسئلہ درپیش ہوا، ان میں سے بعض کو قدرے دیر سے اس کا احساس ہوا کہ زبان محض زبان نہیں ہوتی بلکہ ایک تہذیب بھی ساتھ لاتی ہے۔ اور جو نسل اس سے کٹ جاتی ہے وہ اس تہذیب سے کٹ جاتی ہے۔ لباس صرف لباس نہیں ہوتا وہ اپنے ساتھ ایک تمدنی روایت بھی رکھتا ہے۔ اسے پہننے والا صرف کپڑا ہی

نہیں پہنتا، فیشن ہی اختیار نہیں کرتا، وہ اس قوم کا تمدن اور اس کی اقدار کو بھی گلے لگاتا ہے۔، وہ اس باد و باش ہی کو اختیار نہیں کرتا، اس کے لازمی تقاضے بھی ماننے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار بھی دیا ہے، ارادے اور عزم سے بھی نوازا ہے۔ اسی ارادے اور اسی عزم کے سہارے ہی تو ان مسلم خاندانوں اور افراد کو یہ قوت، یہ ہمت اور یہ توفیق عطا ہوئی کہ وہ اپنے معاشروں سے کٹ کر، اپنے ماحول سے علیحدہ ہو کر ایک مختلف اور اجنبی معاشرے میں نئی دنیائیں تلاش کریں۔ بلاشبہ دوسرے معاشروں میں کامیابی سے اپنی جگہ بنانے والے یہ لوگ اپنے ہم وطنوں سے زیادہ بہادر، زیادہ محنتی اور زیادہ باصلاحیت ہوتے ہیں۔

ہمارا مشاہدہ بتاتا ہے کہ انسان اگر یک طرفہ تمنائیں پالنے، یک رُخا رویے اختیار کرنے اور حدود نا آشنا جبلّتوں کا شکار ہونے کے بجائے محض اپنا رخ سیدھا رکھے تو وہ اسی اجنبی زبان، اسی غیر شناسا معاشرے کی بود و باش اور بعض معاشروں کی بے خدا تہذیب کی غیر مطلوب اور غیر فطری اقدار کے شر سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اگر واقعی اس کے نزدیک اللہ سے رشتہ سب رشتوں سے بڑھ کر ہے، اگر آخرت کا واقعہ اس کے نزدیک یقینی ہے اور رسول ﷺ سے محبت اس کے دل و دماغ پر حاوی ہے تو وہ اپنی جڑوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ یہ جڑیں علم و عمل کی دوری کے سبب ہریالی سے وقتی طور محروم ہو کر خشک تو ہو سکتی ہیں، مردہ نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے غیر مسلم معاشروں میں موجود خاندانوں کو جیسے ہی شناخت کے کھو دینے کا احساس ہوتا ہے، وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ پھر جس کو جہاں سے اور جس انداز سے آگہی ہوتی ہے ان کے اندر کا مسلمان بقدرِ احوال جاگ پڑتا ہے۔ دل و دماغ پر ہلکی سی بھی دستک اسے متنبہ کر دیتی ہے۔ یہ دستک کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے اور کوئی اتفاق بھی۔ ہمارا احساس ہے غیر مسلم معاشروں میں بسنے والے ان لوگوں کا دینی شعور اپنے آبائی ہم وطنوں سے زیادہ توانا اور تعصب کے بجائے عقلی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

اگر ہم اسلام کو دیکھیں تو اصطلاحات کے چکر میں پڑے بغیر ہم کچھ چیزیں ایسی متعین کر سکتے ہیں جن کا ہم اگر اہتمام کریں تو کبھی بھی اپنی شناخت، اپنی مذہبی تہذب اور اپنے تمدن سے محروم نہیں ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں اپنی شناخت سے علیحدہ نہیں ہو سکیں گے۔ یہ چیزیں یہ ہیں اور انھیں ہمارے مذہبی علم میں "سنت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے:

1۔ اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (یعنی بسم اللہ پڑھنا)

2۔ ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اُس کا جواب: "وعلیکم السلام۔

3۔ چھینک آنے پر 'الحمد للہ' اور اُس کے جواب میں 'یر حمک اللہ'۔

4۔ مونچھیں پست رکھنا۔(مردوں کے لیے)

5۔ زیر ناف کے بال مونڈنا۔

6۔ بغل کے بال صاف کرنا۔

7۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔(مرد و خواتین دونوں کے لیے)

8۔ لڑکوں کا ختنہ کرنا۔

9۔ ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔

10۔ حیض و نفاس کے بعد غسل۔

11۔ غسلِ جنابت۔(ہر صورت میں)

12۔ استنجا۔

13۔ میت کا غسل۔اس کی تجہیز و تکفین اور تدفین۔

14۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ

15۔ پانچ وقت کی فرض نمازیں، روزے، کم از کم ایک دفعہ حج کی ادائیگی اور ادائیگی زکوٰۃ

اگر ہم ان اٹھارہ چیزوں کو کسی طور پر بھی اپنے سے علیحدہ نہ کریں تو یہ ہماری وہ جڑیں ہیں جو ہمیں کبھی اپنی شناخت سے علیحدہ نہیں ہونے دیں گی۔

اب آیئے ان چیزوں کی طرف جن کا ہم اگر خیال رکھیں گے تو کوئی بھی تہذیب کوئی بھی سماج ہمارے لیے اجنبی نہ ہو گا۔ان چیزوں کو مد نظر رکھ کر ہم دنیا کی ہر سوسائیٹی کا حصہ بن سکتے ہیں۔اگر آپ غور کریں گے تو احساس ہو گا کہ انھیں یونیورسل اقدار کی حیثیت حاصل ہے:

1۔ حفظِ مراتب:اس کا مطلب ہے کہ خلقت کے اعتبار سے تو تمام انسان برابر ہیں لیکن رشتوں میں برابری نہیں ہے۔اور یہ رشتے صرف رحمی رشتے ہی نہیں بلکہ اس میں تمام معاشرتی رشتے شامل ہیں۔جیسے استاد اور شاگرد کا رشتہ ، میاں اور بیوی کا رشتہ ،ہمسائے کا رشتہ ،عہدے کا رشتہ وغیرہ۔اس میں اگر کوئی ہم سے عمر میں چھوٹا ہی کیوں نہ ہو ،اس کا احترام کرنا ہو گا۔وغیرہ۔

2۔ حفظِ فروج:یعنی جنسی فعل صرف اور صرف نکاح تک محدود رکھیں گے اور وہ اعضاء جن کا اظہار ہر سلیم الطبع شخص فحشاء سمجھتا ہے،اس کا ہر جگہ خیال رکھا جائے گا۔

3۔ **امر بالمعروف اور نہی عنِ المنکر:** اس کا مطلب ہے کہ خیر و شر کے مسلّمات چاہے وہ کھانے پینے سے متعلق ہوں یا تفریح سے، کاروبار کا معاملہ ہو یا قانون کی پابندی کا، انسانی فطرت میں جو چیزیں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور جنھیں پوری انسانیت مانتی ہے، انھیں اختیار کیا جائے گا اور ان کی حمایت کی جائے گی۔ انھیں ہی پروان چڑھانے میں اپنی حمایت پیش کی جائے گی۔ اور جن چیزوں کو فطرت شر سمجھتی ہے، اور پوری انسانیت جن سے نفرت کرتی ہے ان سے ہر حال میں ہم خود بھی بچیں گے اور دوسروں کو بھی بچائیں گے۔

ان بنیادی باتوں کو سامنے رکھ کر ہم ہر سماج اور ہر معاشرے میں اپنی جڑوں کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا حصہ بھی بن سکتے اور اپنی شناخت بھی برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ان چیزوں کا لحاظ رکھنے سے ہم کبھی کسی اخلاقی بحران سے دوچار نہیں ہوں گے۔ ان شاءاللہ

مولانا امین احسن اصلاحی

ایک تاریخی خط

مولانا امین احسن اصلاحی (1904-1997) امام حمید الدین فراہی کے شاگرد اور ان کے طریقہ تفسیر اور فکر کے جید شارح، استاذ جاوید احمد صاحب غامدی کے استاذ اور تفسیر تدبر قرآن سمیت دیگر عظیم کتب کے مصنف تھے۔ وہ کچھ عرصہ جماعت اسلامی کے نمایاں لیڈر بھی رہے مگر پھر 1958 میں اختلاف کی وجہ سے جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ باقی ساری زندگی قرآن و سنت اور حدیث پر تحقیق اور اس کی تدریس میں وقف کر دی۔ پاکستان بننے کے بعد ملک میں اسلام کے مطابق حکومت چلانے کے مطالبے پر انھیں 1949 میں گرفتار کر لیا۔ یہ گرفتاری سراسر غیر متوقع اور صریحاً بے جا اور ظلم پر مبنی تھی۔ وہ دو برس تک بانی جماعت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور سیکرٹری جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کے ہمراہ قید میں رہے۔ قید کے دوران میں انھوں نے اپنے احباب اور اہل خانہ کو خطوط لکھے۔ ہم یہاں ان کا وہ خط شائع کر رہے ہیں جو انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ انوار بیگم صاحبہ کو لکھا۔ یہ خط ظاہر کرتا ہے کہ ایک عالمِ باعمل اپنی اہلیہ کو مصیبت اور آزمائش میں کیسی زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ (مدیر)

سنٹرل جیل ملتان

انوار اختر! اللہ تم کو اور بچوں کو اپنی حفاظت میں رکھے اور اپنے فیصلوں پر راضی اور شاکر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نوادرات

شاید تم کو اور والدہ صاحبہ کو میرے چار اپریل کو رہانہ ہونے سے صدمہ ہوا ہو مگر مجھے امید ہے کہ تم اس صدمے کو پورے جذبے، رضا بالقضا کے ساتھ برداشت کرو گی۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی تھی اور جو کچھ اس کی مرضی ہے اسی میں ہم سب کی بہتری ہے بشرطیکہ ہم کو اس کے فیصلے پر راضی رہنے کی توفیق حاصل ہو۔ میری طرف سے تم اطمینان رکھو۔ محض تمہاری اور والدہ صاحبہ (مولانا کی ساس صاحبہ) کی پریشانی کی وجہ سے مجھے اس کا اگر کچھ خیال ہوا ہو تو ہوا ہو ورنہ الحمدللہ دل بالکل مطمئن ہے اور اس اطمینان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

لاہور میں تو نہ کوئی مکان ملا اور نہ شاید ملے اس وجہ سے اگر تم مناسب خیال کرو تو ابو صالح (مولانا کے بیٹے) کو لکھو وہ تم کو راولپنڈی پہنچا دے۔ وہاں کوئی نہ کوئی انتظام ان شاءاللہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت تو ذہن میں نہیں آتی اور اگر تمھارے سامنے اس کے سوا کوئی اور موزوں شکل ہو تو اس کو اختیار کر سکتی ہو البتہ والد صاحب (مولانا کے سسر) سے مشورہ کر لو۔ میں یہاں سے تو صرف دعا کر سکتا ہوں اور اس سے خدا کے فضل سے غافل نہیں ہوں۔ امید ہے میری دعائیں ان شاءاللہ رائیگاں نہ جائیں گی۔ راولپنڈی جاتے ہوئے اگر تم ضروری سمجھو تو ابو صالح سے کہو کہ مجھ سے بھی تم کو ملاتے ہوئے لے جائے بشرطیکہ تمہارا آنا میرے لیے اطمینانِ قلب اور تسکین کا باعث ہو نہ کہ پریشانی کا۔ میں نے اسی خیال سے تمہارا آنا پسند نہیں کیا تھا اور اب بھی میری اپنی خواہش یہی ہے کہ یہاں آنے کی زحمت نہ اٹھاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس صبر کا بھی صلہ عطا فرمائے گا۔ والدہ صاحبہ سے قدم بوسی کے بعد درخواست کرو کہ میرے لیے برابر دعا کرتی رہیں اور زیادہ تر دعا اس بات کے لیے کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے دین کے راستے میں ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والد صاحب قبلہ اور اماں زینب کی خدمت میں سلام مسنون اور دعا کی درخواست۔ مریم (بیٹی) کو بہت بہت پیار۔ نثار سلمہ (مولانا کی خواہر نسبتی) اور ابو سعید (بیٹے) اور شیمہ کو دعا۔

بس رات دن صرف ایک فکر رکھو کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی پکڑ سے بچائے اور اس کے غضب سے بچنے کے لیے جو کچھ کر سکو خود بھی کرو۔ بچوں کو بھی اس کی نصیحت کرو اور گھر والوں کو بھی اپنے امکان پر اس کی تاکید کرتی رہو۔ اپنے زیورات کی زکوٰۃ فوراً ادا کرو اور سیرت اور قرآن اور استغفار برابر کرتی رہو۔ بس آخرت کے سوا ساری فکریں چھوڑ دو اور فکر اللہ تعالیٰ خود کر لے گا۔

میں اللہ کے فضل سے بہت اچھا ہوں۔ جانِ پدر مریم کو پھر دعا اور پیار۔

امین احسن اصلاحی

چھ اپریل 1949

محمد حسن الیاس

زیورات پر زکوٰۃ: دین کا حکم کیا ہے؟

زکوٰۃ ایک عبادت ہے جو مال کی پاکیزگی، سماجی توازن کے قیام اور اللہ کی رضا کے لیے انفاق کو لازم کرتی ہے۔ یہ نماز کے بعد اسلام کا سب سے اہم مالی فریضہ ہے، جو روحانی تطہیر کے ساتھ دولت کی گردش یقینی بنانے کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ زکوٰۃ اسی انفاق کا ایک منظم اور مقررہ نظام ہے، جس کا ہدف صرف ضرورت مندوں کی مدد تک محدود نہیں، بلکہ اس کا اصل مقصد انسان کو دولت کی آزمائش اور اس کی محبت کے ممکنہ منفی اثرات سے محفوظ رکھنا ہے۔ مزید یہ کہ زکوٰۃ معاشرتی نظم و نسق کے استحکام میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا قانون خود مقرر فرمایا، تاکہ فرد کے مال میں غیر ضروری مداخلت نہ ہو اور ریاستی مالیاتی نظام متوازن رہے۔

زکوٰۃ کی شرح شریعت میں واضح طور پر متعین ہے اور اس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، تاہم نصاب کی تعیین اور اس میں دی جانے والی رعایتیں اجتہادی معاملات میں شامل ہیں۔ خواتین کے زیورات پر زکوٰۃ کے وجوب کا مسئلہ بھی انھی اجتہادی امور میں سے ایک ہے، جس میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

بعض فقہاء ہر طرح کے زیورات پر زکوٰۃ کو واجب قرار دیتے ہیں، جیسے کے احناف کی رائے ہے۔ جبکہ فقہائے مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک صرف وہ زیورات زکوٰۃ کے دائرے میں آتے ہیں جو استعمال میں نہ ہوں اور صرف ذخیرہ اندوزی یا سرمایہ کاری کے لیے رکھے گئے ہوں۔

یہ اختلاف دراصل نصاب کی تعیین میں اجتہادی اطلاق کے فرق کی ایک مثال ہے، جو بدلتے ہوئے حالات اور زمانے کے تقاضوں کے تحت پیدا ہوا ہے۔ موجودہ معاشی اور سماجی تبدیلیوں نے اس بحث کو مزید اہم بنا دیا ہے، کیونکہ جہاں ایک طرف امرا اپنی امارت کے اظہار اور نمائش کے لیے زیورات کا استعمال کر رہے ہیں، وہیں زیورات اب محض دولت جمع کرنے کا ذریعہ نہیں رہے بلکہ ایک ثقافتی اور سماجی حیثیت کی علامت بھی سمجھے جاتے ہیں۔ یہی عوامل اس مسئلے پر از سرِ نو غور و فکر کی ضرورت کو نمایاں کرتے ہیں، تاکہ زکوٰۃ کے قانون اور اصولوں کو عصری تناظر میں زیادہ مؤثر انداز میں سمجھا جا سکے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے بنیادی شرط، جس پر فقہاء کا اتفاق ہے، کسی شے کا 'مالِ نامی' ہونا ہے، یعنی ایسا مال جو بڑھنے اور سرمایہ کاری کے قابل ہو۔ چنانچہ جو فقہاء زیورات پر مطلق زکوٰۃ کے قائل ہیں، وہ درحقیقت انہیں سرمایہ (کیپٹل ایسٹ) کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی بنائے استدلال اصلاً احادیث پر مبنی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے بیان ہونے والی وہ روایات جن سے زیورات پر زکوٰۃ کے وجوب کا استدلال کیا جاتا ہے، درج ذیل ہیں:

حضرت عائشہؓ کی روایت

آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنی چاندی کی انگوٹھیوں کی زکوٰۃ دیتی ہیں؟ جب انہوں نے انکار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہی تمہارے لیے جہنم کی آگ کے لیے کافی ہیں۔ (سنن ابی داود: 1558)

حضرت ام سلمہؓ کی روایت

میں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ اگر ایک عورت کے پاس سونے کا زیور ہو، تو کیا یہ کنز (جمع شدہ دولت) میں شمار ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے تو وہ کنز نہیں رہتا۔ (سنن ابی داود: 1564)

سونے کے کڑوں والی روایت

"نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کو سونے کے موٹے کڑے پہنے دیکھا اور فرمایا: 'کیا تم ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟' جب اس نے انکار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: 'کیا تمہیں پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بدلے آگ کے کڑے پہنائے؟'" (سنن ابی داود: 1563)

وہ فقہاء جو روزمرہ استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ کے قائل نہیں، وہ ان احادیث کی تاویل میں مختلف علمی توجیہات پیش کرتے ہیں، جن میں سے قابل ذکر درج ذیل ہیں:

یہ احادیث ضعیف یا غیر صریح ہیں

بعض محدثین کے نزدیک یہ احادیث یا تو سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں، یا ان میں زکوٰۃ کے وجوب کی صراحت نہیں پائی جاتی۔

مخصوص اطلاقی ہدایت

فقہائے شوافع اور مالکیہ کے مطابق، یہ احادیث ان زیورات سے متعلق ہیں جو بطورِ دولت ذخیرہ کیے گئے ہوں، جبکہ عام استعمال میں آنے والے زیورات اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

اصل اصول میں تبدیلی ممکن نہیں

کچھ محدثین کے نزدیک یہ احادیث در حقیقت زکوٰۃ کی ترغیب کے لیے وارد ہوئی ہیں، نہ کہ زکوٰۃ کے وجوب کی قطعی دلیل کے طور پر۔ اس رجحان کے اصحاب علم ان آثار و روایات سے بھی اس اجتہاد کی تائید کا اشارہ کرتا ہیں جہاں صحابہ و تابعین اسی موقف پر کھڑے ہیں، ایسے چند شواہد درج ذیل ہیں:

جابر بن عبد اللہؓ: لَیْسَ فِی الْحُلِیِّ زَکَاۃٌ (دار قطنی: 170، بیہقی: 7959)

انس بن مالکؓ: ان کی بہن کے زیور پر زکوٰۃ نہیں دی جاتی تھی (دار قطنی: 171)

عبد اللہ بن عمرؓ: اپنی بیٹیوں کے زیور پر زکوٰۃ نہیں دیتے تھے (مصنف ابن ابی شیبہ: 10399)

عائشہؓ اور اسماءؓ: ان کے زیورات پر زکوٰۃ کی ادائیگی ثابت نہیں (مصنف ابن ابی شیبہ: 10398)

امام مالکؒ: زیور کو استعمالی اشیاء میں شمار کرتے ہیں، اس پر زکوٰۃ نہیں (الموطأ: 1/251)

ایک متوازن اور عملی زاویۂ نظر

ہماری طالب علمانہ رائے میں روزمرہ استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ وہ ذاتی ضروریات کے زمرے میں آتے ہیں اور ان کی حیثیت غیر نامی مال کی ہوتی ہے۔ تاہم، اگر زیورات کو محض دولت کے ذخیرے، یا سماجی حیثیت کے اظہار کے لیے رکھا جائے، تو ان کی نوعیت عملاً "مالِ نامی" میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح، اگر زیورات کو بطور محفوظ اثاثہ خریدا گیا ہو، اور ان کا بنیادی مقصد بوقتِ ضرورت فروخت ہو، تو وہ عملی طور پر سرمایہ کاری کے زمرے میں آئیں گے اور ان پر زکوٰۃ کا اطلاق ممکن ہو گا۔

اگر زیورات کی مقدار سماجی عرف کے مطابق غیر معمولی طور پر زیادہ ہو اور ان کا عملی استعمال برائے نام رہ جائے، جیسے کہ شادی بیاہ کے موقع پر اپنی حیثیت کے اظہار کے لیے کئی کئی سو تولہ زیور بچیوں کو اسی غرض سے دیا جاتا ہے، تو احتیاطی تدبیر کے طور پر ان پر زکوٰۃ ادا کرنا زیادہ مناسب ہو گا، تاکہ مال کے حوالے سے دینی ذمہ داری کا احساس اور جوابدہی کا شعور برقرار رہے۔

مزید برآں، وہ افراد جو مالی لحاظ سے مستحکم اور صاحبِ ثروت ہیں، اور جن کے پاس بڑی مقدار میں زیورات موجود ہیں اور وہ سرمایہ کے ذیل میں آتے ہیں تو مناسب ہو گا کہ وہ ریاستی مالیاتی نظام کے تحت زکوٰۃ کی ادائیگی یقینی بنائیں۔

متوسط طبقے کے گھرانوں میں بچیوں کی شادی کے لیے جمع کیے گئے زیورات نہ تو روزمرہ استعمال میں آتے ہیں، نہ ہی ان پر مکمل تصرف حاصل ہوتا ہے، بلکہ وہ محض ایک امانت کے طور پر محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اسی لیے ایسے زیورات کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے۔

اس فقہی اطلاق کے ساتھ، قرآن مجید کی وہ تنبیہ بھی ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے جو انسان کو دولت کی محبت میں مبتلا ہونے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کے انجام سے خبردار کرتی ہے:

ارشاد فرمایا:

سو اُن لوگوں کو دردناک عذاب کی خوش خبری دو جو (اِن میں سے) سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ اُس دن جب اُن کے اِس سونے اور چاندی پر دوزخ میں آگ دہکائی جائے گی، پھر اُن کی پیشانیاں اور اُن کے پہلو اور اُن کی پیٹھیں اُس سے داغی جائیں گی۔ یہی ہے جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا، سو چکھو اُس کو جو تم جمع کرتے رہے ہو۔ (التوبہ: 34)

استاد مکرم اس کی توضیح میں لکھتے ہیں:

زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد حال اور مستقبل کی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے لیے روپیہ جمع رکھنا ممنوع نہیں ہے، لیکن خلق یا خالق کی طرف سے اُس کے انفاق کا کوئی مطالبہ سامنے آجائے اور آدمی اُسے خرچ کرنے سے انکار کر دے تو اُس کی سزا وہی ہے جو قرآن نے آگے بیان کر دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"۔۔۔یہی انفاق حکمت کا خزانہ بخشتا ہے، اِسی سے نور قلب میں افزونی ہوتی ہے۔ اگر مال کے ڈھیر رکھتے ہوئے کوئی شخص اپنے پاس پڑوس کے یتیموں، بے کسوں، ناداروں سے بے پروا رہے یا دعوت دین، اقامت دین، تعلیم دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے دوسرے کاموں سے بے تعلق ہو جائے تو وہ عند اللہ مواخذے اور مسؤلیت سے بری نہیں ہو سکتا، اگرچہ اُس نے اپنے مال کا قانونی تقاضا پورا کر دیا ہو۔" (تدبر قرآن ۳/۵۶۶)

نورالہدیٰ شاہ

انوکھی معافی

معروف ڈرامانگار محترمہ نورالہدیٰ شاہ کی زندگی کا محیر العقول واقعہ ہمیں زندگی کو بہت غور سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

تقریباً چھ سال پہلے دبئی کے ہسپتال میں میری نواسی وقت سے بہت پہلے ساتویں مہینے کی ابتدا میں ہی پیدا ہو گئی۔ میرے گھر کا وہ پہلا بچہ تھی۔ شادی کے چار سال بعد میری بیٹی کے ہاں بچہ ہوا تھا مگر وہ بھی ان حالات میں کہ لگتا تھا کہ مکمل بنی بھی نہیں ہے۔ بالوں بھرا ننھا سا بندر کا بچہ جس کا پورا ہاتھ میری انگلی کی ایک پور پر آتا تھا۔

زندہ رہے گی یا نہیں؟ زندہ رہے گی تو نارمل ہو گی یا نہیں؟

ان سوالوں کا جواب ڈاکٹرز کے پاس بھی نہیں تھا۔ ہر روز ڈاکٹرز بتاتے کہ بس ختم ہوا چاہتی ہے، فوراً پہنچو۔ بھاگے بھاگے پہنچتے۔ پھر کچھ سانسیں لینا شروع کرتی تو ایک امید کے ساتھ گھر لوٹتے۔ مگر اگلے دن امید پھر دم توڑ دیتی۔ ہاتھوں پیروں کی انگلیاں نیلی پڑ جاتیں۔ پوچھنے پر بتایا جاتا کہ اگر بلڈ سرکیولیشن نارمل ہو گئی تو یہ ٹھیک ہو جائیں گی ورنہ جسم کا ناکارہ حصّہ بن جائیں گی۔ وینٹ پر بے دم پڑی بچی نے ہماری سانسیں پھلا دیں۔ کبھی دماغ کا ٹیسٹ بتاتا کہ دماغی طور پر نارمل نہ ہو گی۔ کبھی دل میں سوراخ ملتا۔ کبھی آنکھوں کا معاملہ سامنے آجاتا۔ اوپر سے خرچہ اتنا کہ تین لاکھ درہم پندرہ دن کا بل بن گیا۔ میرا حال یہ تھا کہ میرے سامنے میری اپنی بیٹی کے بھی آنسو تھے اور اس کے بچے کی ناممکن زندگی بھی۔ تھک کر چوُر ہو گئی۔ ایک بار تو ڈاکٹر کو بھی کہہ دیا کہ اس کو بچانے کی کوشش نہ کریں۔ بچ بھی گئی تو پتہ نہیں کس حال میں ہو گی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کون ہوتی ہیں زندگی چھیننے کا فیصلہ کرنے والی!

Picture credit Dawn Images

ناقابل فراموش

انہی حالات میں ایک دن نماز میں کھڑے ہوئے میں رو دی۔ اللہ کو بے بسی سے مخاطب کر کے کہا کہ یااللہ مجھ سے ایسا کیا گناہ ہو گیا ہے کہ جس کی یہ سزا ہے؟

بالکل ہی اگلے لمحے چھپاک سے ایک منظر کی تصویر اور اس میں ایک چہرہ صرف ایک سیکنڈ کے لیے میری نگاہ یا ذہن سے گزر گیا اور حیرت کی بات کہ اگلے سیکنڈ میں مجھے یاد بھی نہ رہا کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔

پوری نماز اسی کشمکش میں گزری پر یاد ہی نہ آیا۔ اگلے دو دن، دبئی کی سڑکوں پر ہسپتال اور گھر کے بیچ آتے جاتے، رات کو بستر میں، میں اسی کشمکش سے گزرتی رہی۔ پر یاد ہی نہ آیا کہ دیکھا کیا تھا میں نے۔ اپنے جتنے بھی گناہوں اور خطاؤں کی فہرست میرے ذہن میں تھی، انہیں گنتی رہی مگر کسی سے اس منظر کا نشان نہیں مل رہا تھا۔

دو دن بعد اچانک یاد آ گیا کہ وہ کیا منظر اور چہرہ تھا۔

پندرہ برس پرانا وہ واقعہ مجھے کبھی بھی یاد نہ آیا تھا۔

میری ایک بہت ہی قریبی رشتہ دار لڑکی، شوہر اور حالات کے ہاتھوں ستائی ہوئی، دو بچوں کو ساتھ لیے چھوٹے سے ٹاؤن سے حیدر آباد شفٹ ہوئی تھی کہ اس کا تو مستقبل تاریک تھا ہی پر کسی طرح بچوں کا مستقبل سنور جائے۔ اس کے بیٹے بیٹی کو میں نے حیدر آباد کے بہت ہی اچھے اسکولوں میں داخل کروایا۔ اسے بچوں سمیت تب تک اپنے گھر میں رکھا جب تک ان کی رہائش کا بندوبست نہ ہوا۔ اسی دوران اس کی بیٹی کا نویں کلاس کا بورڈ کا امتحان بھی ہوا اور وہ بچی اے گریڈ مارکس لے کر پاس ہو گئی۔ رزلٹ کے اگلے دن وہ بچی روتی ہوئی اسکول سے لوٹی۔ پتہ چلا کہ کلاس ٹیچر مس حبیب النسا نے اسے پوری کلاس کے سامنے کہا ہے کہ تم تو اتنے نمبر لینے والی نہیں ہو۔ کس سے سفارش کروائی ہے؟

بھری کلاس میں اس بے عزتی پر وہ بچی بری طرح رو رہی تھی۔ بچی کی حالت دیکھ کر ماں بھی رو رہی تھی۔ اوپر سے بچی نے کہہ دیا کہ اب وہ اس اسکول نہیں جائے گی۔

میں ہمیشہ سے مظلوم کے حق کے لیے لڑنے مرنے پر تُل جانے والی رہی ہوں اور اس طرح کے جھگڑوں میں خدائی فوجدار کی طرح کُود پڑنے کی عادت رہی ہے میری۔

فوراً گاڑی نکالی اور پہنچ گئی اسکول۔ حیدر آباد کے اکثر لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ میں سیدھی پرنسپل کے آفس میں گئی اور ہنگامہ مچا دیا کہ ایک بچی اپنی محنت سے پڑھی ہے۔ ایک چھوٹے ٹاؤن سے مستقبل بنانے آئی ہے اور حالات کی وجہ سے پہلے سے ہی سہمی ہوئی ہے۔ اس کی اس طرح ٹیچر حبیب النسا نے پوری کلاس کے سامنے انسلٹ کی ہے!

میرے ہنگامے پر مس حبیب النسا کو حاضر کیا گیا۔ سادہ سی خاتون مگر چہرے پر ٹھہراؤ۔ کہنے لگیں ہاں میں نے کہا

ہے، کیونکہ مجھے وہ بچی اتنی ہوشیار نہیں لگتی جتنے نمبر اس نے لیے ہیں۔ یقیناً یا سفارش کی ہے، یا کاپی کی ہے۔

مجھے پتہ تھا کہ وہ بچی بچاری سفارش کروانے کی طاقت نہیں رکھتی۔ نہ ہی اپنی سہمی ہوئی شخصیت کی وجہ سے کاپی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ رٹے مار کر اس نے امتحان دیا تھا اور اتفاق سے وہی سوال آ گئے جن کے جواب اسے یاد تھے۔

میں مس حبیب النسا پر برس پڑی کہ یہ کہاں کا انصاف ہے! آپ صرف چھوٹے شہر کی بچی دیکھ کر اسے کمتر قرار دے رہی ہیں اور اس کا مستقبل برباد کر رہی ہیں۔ میری آواز یوں بھی بھاری ہے، اس میں مزید گرج آ گئی۔ مس حبیب النسا اسکول کی باقی ٹیچرز کی بھی ناپسندیدہ تھیں۔ سو ان کی کھنچائی کا تماشہ دیکھنے پرنسپل کے آفس کے باہر ٹیچرز جمع ہو گئیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بھی خوش تھیں کہ چلو کوئی تو ہے مس حبیب النسا کو سنانے والا۔

قصہ مختصر کہ پرنسپل نے بھی کچھ سخت الفاظ کے ساتھ اس کی کھنچائی کی اور میرے ساتھ میرے گھر آ کر اس بچی کو سوری کہا۔ یوں یہ معاملہ تمام ہوا۔

یہ نیتاً میری ایک نیکی تھی۔ ایک مظلوم ماں اور اس کی بچی کی مدد۔

دبئی میں جب سسک کر نماز میں جب میں نے اللہ کو کہا کہ مجھ سے ایسی کیا غلطی ہو گئی ہے جس کی سزا میں مجھ پر اولاد کی تکلیف آ گئی ہے۔۔۔ جواب میں وہ حیات اسکول کی پرنسپل کے آفس کے اس منظر کی ایک سیکنڈ کی تصویری جھلک اور مس حبیب النسا کا چہرہ تھا۔

میں کراچی آئی۔

میری ایک کزن مس حبیب النسا کے ساتھ اسی اسکول میں پڑھاتی رہی تھیں۔ میں نے سلویٰ سے مس حبیب النسا کا نمبر مانگا اور اسے پوری بات بتائی۔

سلویٰ بتانے لگی میں نے بچپن مس حبیب النسا کے ساتھ قرآن پڑھتے ہوئے گزارا ہے۔ وہ حافظِ قران ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ اور حدیث سنَد کے ساتھ پڑھی ہوئی ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے اپنے ضعیف والدین کی خدمت میں جوانی گزار دی مگر شادی نہ کی کہ والدین کو ان کی ضرورت تھی۔ اپنے آخری دنوں میں ان کے والد بہت ہی ضعیف اور مشکل ہو گئے تھے مگر وہ کبھی اس مشکل ڈیوٹی میں اُف تک نہ کہتی تھیں بلکہ والد کے پیچھے پیچھے دوڑی دوڑی پھرتی تھیں۔ ان کے غسل خانے کے کام بھی وہ اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔

سلویٰ سے نمبر لے کر میں نے مس حبیب النسا کو فون کیا۔ میرا نام سن کر وہ خوش ہو گئیں۔ میں نے کہا کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ فوراً کہا کہ آ جائیے۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی میں کراچی سے حیدرآباد سیدھی ان کے گھر پہنچ گئی۔ وہ کچھ بوڑھی اور کمزور ہو چکی تھیں۔ اس بات پر خوش تھیں کہ ایک مشہور رائٹر خاص طور پر ان سے ملنے آئی ہے۔

خوش ہو کر کہنے لگیں کہ میں ریٹائر ہو چکی ہوں اور حیات اسکول چھوڑ چکی ہوں اور ایک پرائیویٹ اسکول میں پرنسپل ہوں۔ آپ کا فون آیا تو میں نے اپنی ٹیچرز کو بتایا کہ نورالہدیٰ شاہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میری ٹیچرز نے کہا کہ ان کا بیوہ عورت کے حقوق سے متعلق ایک ڈرامہ چل رہا ہے۔ وہ اس موضوع پر آپ سے شرعی مشورہ کرنا چاہتی ہوں گی۔

میں نے کہا، آپ کو یاد ہے میں حیات اسکول میں آپ کی شکایت لے کر آئی تھی؟

انہوں نے لمحہ بھر سوچا، پھر انکار میں سر ہلا دیا کہ مجھے یاد نہیں۔

میں نے یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ پرنسپل کے آفس میں میں بہت اونچی آواز میں سخت الفاظ کے ساتھ آپ سے لڑی تھی۔۔ آپ کی انسلٹ کی تھی۔ آپ کو یاد ہے؟

ذرا سوچا، پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ انہیں واقعی وہ واقعہ یاد نہیں تھا۔

قریب ہی بیٹھے ہوئے میں نے جھک کر ان کے پیر چھو لیے اور ان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں نے ایسا کیا تھا اور میں آپ سے اپنے اس عمل کی معافی مانگنے آئی ہوں۔

مس حبیب النسا نے ایک دم سے معافی کے لیے جڑے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ یہ نہیں پوچھا کہ آج اتنے برسوں بعد کیسے یہ خیال آیا اور کس مجبوری نے تمہیں جھکایا ہے۔ انتہائی سنجیدگی سے کہا میں نے آپ کو معاف کر دیا ہو گا جو وہ بات یاد نہیں رہی پھر بھی میں نے آپ کو دل سے معاف کیا۔ اللہ میری معافی آپ کے لیے قبول فرمائے اور آپ جس بھی مشکل میں ہیں اسے آسان کرے اور آپ پر آئی ہوئی آزمائش کو معاف کرے۔

اس کے بعد انہوں نے بات بدل دی۔ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ بڑے شوق سے مجھے کھلاتی پلاتی رہیں۔ دعاؤں کے ساتھ مجھے خدا حافظ کہا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات میں انہوں نے بات کا رُخ اس طرف آنے ہی نہیں دیا کہ میں اپنی مجبوری کی اصل کہانی انہیں سناتی۔

چند دنوں بعد میں واپس دبئی لوٹ گئی جہاں این کیو بیٹر میں ایک ننھی سی جان میں ہماری جان پھنسی ہوئی تھی۔

میری وہ نواسی اس سال ستمبر میں چھ سال کی ہو جائے گی۔ ماشاءاللہ بہت ہی شرارتی ہے۔ بہت ہی ذہین اور باتونی۔ گھنگریالے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ بالکل ہی گڑیا سی لگتی ہے۔ اللہ نے اسے ہر عیب سے بچا لیا۔ بس

ناقابل فراموش

ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی اوپر کی پور نیلی پڑنے کے بعد دوبارہ نارمل حالت میں نہیں آئی اور انگلی سے جھڑ گئی۔اس ایک پور کی کمی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ انسان کی تخلیق کا معاملہ کیا ہے اور کس کے ہاتھ میں ہے۔

مس حبیب النسا آج بھی حیات ہیں۔

سوشل میڈیا نے حقوق العباد کے معاملے میں معافی کو بہت آسان کر دیا ہے۔ایک میسیج بناؤ نئے اسلامی سال کے آغاز یا شبِ برات پر پوسٹ لگا دو کہ اگر مجھ سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو یا زیادتی کی ہو تو اللہ کے واسطے معاف کر دے۔۔اور پر سکون ہو کر سو جاؤ۔

اتنی آسانی سے حقوق العباد کی معافیاں اگر روزِ محشر بھی ہو گئیں تو یقیناً حساب مختصر ہو جائے گا اور پچاس ہزار سال کے برابر گرم ترین دن جس نے انسانوں کو سروں تک پسینے میں ڈبو دیا ہو گا، کی ضرورت نہیں رہے گی اور ہم جلد از جلد بہشت کے باغوں میں پہنچ چکے ہوں گے

معافیوں کی اسی طرح کی ایک رات میں حیدر آباد سے کراچی سفر کر رہی تھی۔اسی سفر کے دوران سوشل میڈیا پر معافیوں کا لین دین پڑھتے ہوئے مجھے اپنا یہ ذاتی تجربہ یاد آ گیا۔

یہ تجربہ مجھے سکھا گیا کہ معافی دراصل کیا چیز ہوتی ہے اور نیکی کرنے کا تکبر انسان کو کس طرح سزا کا مستحق بناتا ہے۔ہم محض اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم رسمی معافی تلافی کرتے ہوئے پچھلی گلی سے بہشت کی طرف نکل جائیں گے۔

معافی آپ کی انا کے ٹکڑے ٹکڑے مانگتی ہے جو رب کو نہیں چاہیے، بلکہ اس انسان کے پیروں میں جا کر رکھنے ہوتے ہیں، جس کے ساتھ آپ نے زیادتی کی ہوتی ہے۔

نامور خواتین

نعیم احمد بلوچ

ملکہ سبا: دورِ سلیمان علیہ السلام کی عظیم حکمران

اسلام کے حوالے سے غلط طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اس میں عورت کو ایک کم تر انسان قرار دیا جاتا ہے۔ اسے زندگی کے چند شعبوں ہی میں قابل قبول کارکردگی کا اہل جانا جاتا ہے۔ لیکن یہ تصور ناقص فہم دین، قلتِ تدبر اور قلتِ مطالعہ کی وجہ سے ہے۔ قرآن مجید ساڑھے نو سو برس قبل از مسیح میں ایک ایسی خاتون حکمران کا تفصیلی ذکر کرتا ہے جس سے ان سارے خیالات و تصورات کی نفی ہوتی ہے۔ وہ ملکہ سبا کو ایک محیر العقول حکمت اور دانائی کی حامل خاتون کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ملکہ سبا کے بارے یہ مضمون قرآن مجید، بائبل اور تاریخ کے غیر مذہبی ذرائع کی مدد سے لکھا گیا ہے۔

اے آئی کی بنائی ہوئی ملکہ سبا کی خیالی تصویر

یہ 965 قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ فلسطین اور شرق اردن سے لے کر شام تک پھیلی ہوئی سلطنت کو دنیا میں سپر پاور کی حیثیت حاصل تھی۔اس کے حکمران حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے حضرت سلیمان تھے۔ انہیں یہ سلطنت اس وقت ملی جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سخت آزمائش میں پورا اترے۔

یہ آزمائش اس وقت پیش آئی جب ان کی سلطنت کا ایک حصہ دشمنوں کے قبضے میں چلا گیا۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سلطنت کا یہ حصہ واپس حاصل کر لیا۔اس کے بعد انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کی سلطنت کو پوری دنیا میں بے مثال بنا دے۔ اور یہ سلطنت اپنی طاقت اور شان و شوکت میں ایسی منفرد ہو کہ اپنے زمانے میں اس کی کوئی مثال نہ ہو۔ سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا قرآن مجید میں ان الفاظ میں آئی ہے:

"اے میرے پروردگار مجھے معاف فرمادے اور مجھ کو ایک ایسی مضبوط اور عالی شان سلطنت عطا فرما جو میرے سوا کسی کو نہ جچتی ہو۔ بے شک تو بڑا ہی عطا کرنے والا ہے۔"

اے ائی کی مدد سے بنائی گئی حضرت سلیمانؑ کی خیالی تصویر

حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا اس شان سے پوری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس حوالے سے سورہ سبا میں ان کی سلطنت کی جو خصوصیات بتائی ہیں، اس کے مطابق تیز ہواؤں کو ان کے لیے مسخر کر دیا گیا۔ یعنی حضرت سلیمان کو ایسا علم اور ایسی مہارتیں میسر آئیں ان کے جہاز تیز ہواؤں سے سازگار ہو کر چلتے۔ جہاں کہیں کا وہ قصد کرتے یہ ہوائیں ان کے جہازوں کو مہینوں کا سفر دنوں میں کراتیں۔ اور انھیں تانبے کی صنعت کا علم بھی ہو گیا تھا۔

ان کے پاس ایسے ماہرین تھے جو تانبے کو پگھلانے اور اسے ڈھالنے کا فن جانتے تھے۔ ان کے لیے ایسے جنات بھی مسخر کر دیے جو ان کے لیے کام کرتے۔ ان جنات کی دو قسمیں تھیں ایک وہ جو خوش دلی سے آپ کا حکم مانتے اور کچھ جنات وہ تھے جو آپ کی اطاعت پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں اگر کوئی ان کے حکم سے سرتابی کرتا تو سزا پاتا۔ یہ جن ماہر معمار، خوطہ خور اور کئی فنون کے ماہر تھے۔

حضرت سلیمان کی ایک اور طاقت جانوروں کی بولی جاننا تھا۔ وہ پرندوں، جانوروں حتیٰ کہ حشرات کی حرکات و سکنات سے ان کا مدعا جان لیتے اور ان سے ابلاغ بھی کرتے تھے۔ گمانِ غالب ہے کہ ان میں اکثر علوم بابل شہر میں اترنے والے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کے ذریعے سے اس زمانے میں لوگوں کی دسترس میں آئے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ جنوں، انسانوں اور پرندوں کے سارے لشکر جنگی مشقوں اور معائنے کے لیے حضرت سلیمان کے سامنے جمع ہوئے۔ اس "پریڈ" کے دوران میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ بات نوٹ کی کہ ایک ہدہد ابھی تک حاضر نہیں ہوا۔ یاد رہے ہدہد تمام پرندوں میں واحد پرندہ ہے جو پیغام رسانی، بلندی سے دیکھنے اور چیزوں کو سمجھنے کی خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ جدید زبان میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ حضرت سلیمان کے لیے "ڈرون" کا کام کرتا تھا۔

اسے غائب پا کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ناراضی کا اظہار کیا لیکن وہ جلد ہی آن موجود ہوا۔ اس نے پریڈ میں دیر سے آنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ مجھے وہ بات معلوم ہوئی ہے جو آپ کے علم میں نہیں ہے۔ میں سبا کے علاقے سے ایک سچی خبر آپ کے پاس لایا ہوں۔

سبا کا ملک آج "یمن" کہلاتا ہے اور اس زمانے میں اس کے دار السلطنت کا نام "مارب" کہلاتا تھا۔ یہ یروشلم سے ڈھائی ہزار میل کے فاصلے پر تھا۔

ہدہد نے بتایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ ایک عورت اس ملک پر حکمرانی کر رہی ہے اور اسے ہر طرح کا ساز و سامان میسر ہے اور اس کا بہت بڑا تخت بھی ہے۔ میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے بجائے سورج کو سجدہ کرتی ہے۔

ہدہد کی تقریر سن کر حضرت سلیمان کو لگا کہ وہ شاید اپنے غائب ہونے کے لیے کوئی بہانہ گھڑ رہا ہے۔ اس کی خبر کی تصدیق کرنے کے لیے یا اپنے ذرائع سے معلوم ہونے کے بعد انھوں نے اسے ایک خط دیا اور ملکہ سبا کی طرف بھیج دیا اور کہا کہ خط دے کر وہاں سے ہٹ جانا اور پھر دیکھنا کہ ملکہ اس پر کیا ردعمل ظاہر کرتی ہے۔

ہدہد نے ایسا ہی کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو خط ملکہ سبا کو بھیجا اس کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے کہ اس کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کیا گیا اور ملکہ سبا کو حکم دیا گیا کہ وہ حضرت سلیمان کی سلطنت کی اطاعت قبول کرتے ہوئے ان کے دربار میں حاضر ہو۔

اس زمانے میں رعایا چونکہ اپنے بادشاہ ہی کے مذہب پر ہوتی تھی، اس لیے یہ ضروری تھا کہ ملکہ سبا خود اسلام قبول کرتیں اور حضرت سلیمان کی اطاعت کرتے ہوئے ان کی بالادستی تسلیم کرتیں۔ یہ ویسا ہی حکم تھا جیسا کہ سورۃ توبہ میں بیان ہوا ہے کہ رسولِ کریم حضرت محمد ﷺ کو فرمایا گیا تھا کہ وہ معاصر ریاستوں کو مدینہ کی ریاست کی اطاعت کرنے کا حکم دیں اور ان پر واضح کریں کہ انھیں اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے وہ اسلامی ریاست کی بالادستی تسلیم کریں۔

ملکہ سبا نے خط سن کر درباریوں سے مشورہ کیا اور کہا کہ میں اس معاملے میں مجھے رائے دو۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ میں کسی معاملے کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم لوگوں کا فیصلہ ساتھ شامل نہ ہو۔

قرآن مجید میں موجود اس ایک جملے سے واضح ہوتا ہے کہ ملکہ ہرگز کوئی مطلق العنان حکمران نہ تھی بلکہ وہ اہل رائے وزیروں مشیروں کے مشورے سے حکومت چلاتی تھیں۔ یہ خوبی انھیں اپنے وقت کے حکمرانوں سے بہت ممتاز کرتی ہے۔

درباریوں نے جواب دیا کہ ہم طاقتور بھی ہیں اور اعلیٰ جنگی صلاحیت رکھنے والے بھی ہیں۔ یعنی اگر آپ اطاعت کے بجائے مقابلے کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

درباریوں کا یہ جواب عام روایات کے مطابق تھا۔ وہ ہر حالت میں اپنے آپ کو فرماں بردار اور جاں نثار ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ لیکن ملکہ نے جہاں دیدہ ہونے کا ثبوت دیا اور اس زمانے میں طاقت ور بادشاہوں کا وتیرہ

بتاتے ہوئے کہا کہ جب وہ کسی شہر کو فتح کر کے اس میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو درہم برہم کر دیتے ہیں اور اس کے اشرافیہ کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اگر سلیمان بھی ایسے ہی حکمران ہوئے تو ان سے ہمیں اپنے اس کو خوش حال ملک کو محفوظ رکھنے کے لیے مقابلے سے پہلے صلح کی طرف آنا چاہیے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ میں اپنے سفیر ان کی طرف ہدیہ کے ساتھ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ میرے سفیر کیا جواب لاتے ہیں۔ یوں ملکہ نے ایک درمیانی راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

اس احتیاط کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سبا کی یہ ریاست مصر کے زیر اثر تھی اور حضرت سلیمان کی بالادستی تسلیم کر کے وہ اپنے لیے مشکلات پیدا کر سکتی تھیں۔ اس لیے ملکہ ایسا سوچنے میں حق بجانب تھی جبکہ حضرت سلیمان کا یہ عمل حکمِ الٰہی کے تحت تھا۔

ملکہ کی سفارت حضرت سلیمان کے پاس پہنچی تو ان کا جواب سورۃ النمل میں ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

"کیا تم لوگ مجھے یہ مال پیش کر کے (اپنے باطل دین پر قائم رہنے میں) تعاون چاہتے ہو؟ لیکن جو کچھ اللہ نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو اس نے تمھیں دیا ہے۔ یہ تمھی لوگ ہو جو اپنے ہدیوں سے خوش ہوتے ہو۔ ہم ان پر راضی ہونے والے نہیں ہیں۔ اس لیے اب تم اپنی قوم میں (ان تحفوں سمیت) واپس جاؤ۔ اب ہم ان کے خلاف ضرور ایسے لشکر لے کر آئیں گے کہ وہ ان کے مقابلے کی تاب نہ لا سکیں گے۔ اور ہم انہیں وہاں سے مغلوب کر کے نکال دیں گے یا وہ ہمارے زیر دست بن جائیں گے۔"

اس جواب میں ملکہ کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ سلیمان کوئی عام فرماں روا نہیں ہیں۔ اس کی دانش نے اسے یہی سمجھایا کہ اسے سلیمان کا اصل مطالبہ پورا کرنا چاہیے۔ اس نے پیغام بھیجا کہ اس نے سلیمان سے ملنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ وہ جلد خود حاضر ہو گی۔

یہ اطلاع حضرت سلیمان تک پہنچی تو انھوں نے ملکہ کے سب سے بڑے فخر یعنی اس کے تخت کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں کسی بادشاہ یا ملکہ کی شان و شوکت کا اندازہ اس کے عالی شان تخت سے بھی لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت سلیمان نے اپنے دربار کے طاقت ور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ کون ملکہ سبا کا تخت اس کے آنے سے بھی پہلے مجھے لا کر دے سکتا ہے۔

جنوں میں سے ایک طاقت ور جن نے کہا کہ میں یہ تخت اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے پہلے حاضر کر دوں گا۔ اور میں اس کام پر قدرت رکھنے والا ہوں۔

پھر ایک ماہر فن شخص نے کہا کہ اتنی دیر بھی نہیں لگے گی۔ میں اس تخت کو پلک جھپکنے سے پہلے حاضر کر دوں گا۔ اتنا کہہ کر اس نے تخت حاضر بھی کر دیا۔ روایات میں اس کا نام "آصف برخیا" آتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ ہاروت وماروت کے سکھائے گئے علم کا بہت بڑا ماہر تھا۔ شاید اس کا علم اسی طرح کا تھا جس طرح کے علم ومہارت کے مظاہرے مصر کے اہرام، انگلستان کے سٹون ہنج اور دیگر پرانی تاریخوں کی پراسرار عمارتوں کو بنانے میں دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی اس علم کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا یہ ایک مادی علم ہی تھا۔ آج ہم ہزاروں کلو میٹر دور کے مناظر کو سامنے دکھا سکتے ہیں لیکن اس ماہر نے مادی طور پر ہی اس تخت کو سلیمان علیہ السلام کے سامنے لا حاضر کیا۔

انھوں نے تخت کو جب اپنے پاس موجود پایا تو فرمایا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے کہ ایسے ماہرینِ فن اور میرے حکم کے تابع اور ایمان دار لوگ میری سلطنت میں موجود ہیں۔ یقیناً اس میں میرا کوئی کمال نہیں بلکہ یہ میرا امتحان ہے کہ میں شکر گزار بنتا ہوں یا ناشکری کا رویہ اختیار کرتا ہوں۔

حضرت سلیمان نے حکم دیا کہ اس تخت کی شکل میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دی جائے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا کہ وہ ملکہ کی بصیرت کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ یعنی کیا اسے احساس ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی شان وشوکت کا مالک ہو سکتا ہے یا وہ اپنے تکبر میں مبتلا ہے۔ حضرت سلیمان کی بات کو ہم فرعون کے رویے سے سمجھ سکتے ہیں جس نے حضرت موسیٰ کے عصا اور ید بیضا کو پہچاننے کے بجائے اسے ایک حقیر قسم کا جادوئی کرتب قرار دیا اور مقابلے پر آ گیا۔

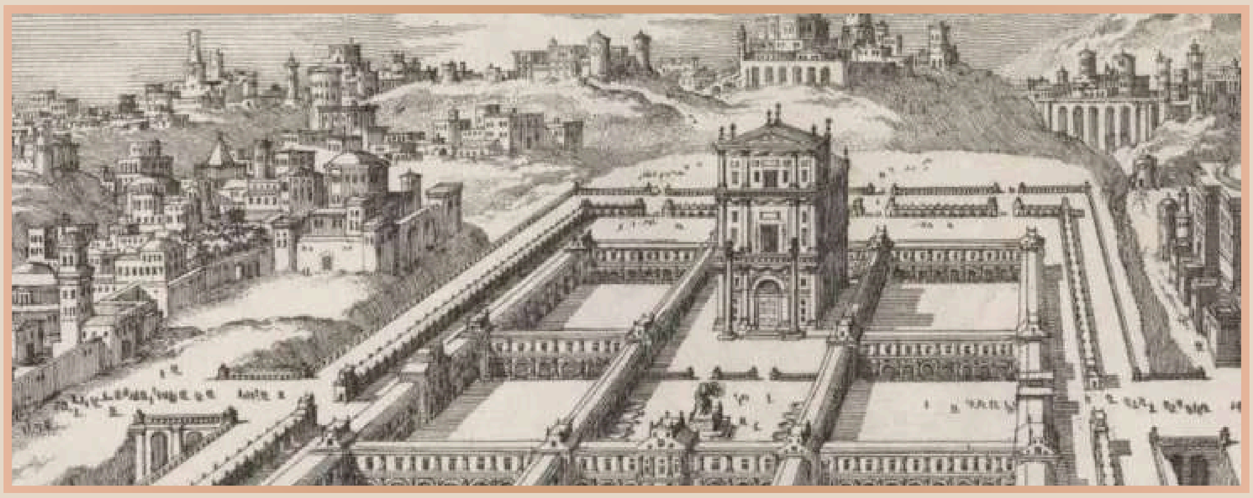

اب ملکہ سبا پوری شان سے حضرت سلیمان کے دربار میں حاضر ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے ان کی نظر تخت ہی پر پڑی اور حضرت سلیمان نے بھی اس کی آنکھوں کی حیرت کو بھانپ لیا ہو گا اور تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سوال کیا کہ کیا آپ کا تخت بھی ایسا ہی ہے؟

ملکہ نے بھی رمز شناسی کا مظاہرہ کیا اور یہ نہیں کہا کہ حضور یہ آپ میرا ہی تخت اٹھا لائے ہیں بلکہ حیرت و مرعوب ہو کر کہا کہ تقریباً ویسا ہی ہے لیکن یہ وہ نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔ ظاہر ہے ملکہ نے اپنا تخت یقیناً پہچان لیا ہو گا لیکن انھوں نے اسے اپنا قرار دے کر حضرت سلیمان کو غاصب قرار نہیں دیا۔ یقیناً ملکہ اس تخت کو دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوئی ہوں گی یہ تخت بلاشبہ انھی کا ہے لیکن یہ ان کے آنے سے پہلے یہاں کیسے پہنچ گیا اور اس کے اندر دکھائی دینے والی تبدیلیاں کیسے کر دی گئیں؟ اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ تبدیلیاں اس تخت کی خوب صورتی اور شان کو مزید بڑھانے کا باعث بنی ہیں۔

تخت کے علاوہ ملکہ نے دربار کی ساخت، اس کی شان و شوکت اور جنوں کے سردار اور آصف بر خیا جیسے بہت سے درباریوں کا رعب و دبدبہ دیکھا ہو گا تو اس کی مرعوبیت کا اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ملکہ کی حیرتوں کا سلسلہ اسی پر ہی نہیں رکا بلکہ جب سیر دیکھتے ہوئے وہ کسی دوسرے ہال میں داخل ہونے لگیں تو انھیں محسوس ہوا کہ فرش پر پانی ہے۔ حضرت سلیمان نے بھی انھیں آگے چلنے کے لیے کہا تا کہ وہ ان سے پہلے فرش پر پاؤں رکھیں۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جو حضرت سلیمان چاہتے تھے۔ ملکہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے مجبور ہوئیں کہ اپنے قیمتی لباس کو گیلا ہونے سے بچانے کے لیے اسے ذرا اٹھا لیں۔ اب وہ اپنا لباس اٹھائے ہوئے حضرت سلیمان کی طرف متوجہ ہوئیں تو ان کی حیرتوں کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

حضرت سلیمان تو فرش پر خراماں خراماں چل رہے تھے۔ تب انھوں نے یقیناً مسکراتے ہوئے کہا ہو گا کہ یہ شیشوں سے بنا ہوا فرش ہے۔ اور پانی شیشے کے نیچے ہے۔ اب ملکہ سبا کو تسلیم کر لینے میں کوئی مانع نہ رہا کہ اس کا محل سلیمان کے اس "شیش محل" کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ اور اپنے ملک کو وہ دنیا کا سب سے خوشحال ملک سمجھتی تھی لیکن وہ سلیمان کے مقابلے میں ایک دیہاتی ہے اور اس کا سلیمان سے کوئی مقابلہ نہیں۔

وہ بے ساختہ پکار اٹھیں کہ اے میرے رب میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا اور اب میں سلیمان کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ رب العٰلمین کے حوالے کرتی ہوں۔

ظاہر ہے اس سے پہلے یا بعد میں حضرت سلیمان نے انھیں ان کے "بدلے ہوئے تخت" کا راز بھی بتا دیا ہو گا۔ انھیں اپنے لشکروں سے "گارڈ آف آنر" کی طرح کی سلامی بھی دلائی ہو گی۔ اپنے خزانوں اور ترقی کی کچھ جھلک بھی دکھائی ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس "ہدہد" سے بھی ملاقات کرائی ہو جو ان کی ساری خبریں ان تک پہنچاتا رہا تھا۔

ملکہ سبا کا یہ جملہ اس کی فطرتِ سلیم کی گواہی دیتا ہے۔ وہ نہ فرعون و نمرود کی طرح اکڑیں اور نہ انھوں نے وہ رویہ اختیار کیا جو قیصرِ روم نے اختیار کیا تھا کہ حقیقت واضح ہونے کے باوجود اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا۔

بلکہ ان کا رویہ حبشہ کے نجاشی جیسا تھا کہ حق اب واضح ہے اس لیے اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارا نہیں۔
حضرت سلیمان کی حکمت عملی کی بھی تصدیق ہوئی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ملکہ جب تک اس بات کو دل ودماغ سے مان نہیں لیتی کہ یہ شان وشوکت کسی انسان کی پیدا کردہ نہیں ہو سکتی، اس وقت تک وہ ملکہ ہوتے ہوئے کسی اور کی بالادستی تسلیم نہیں کر سکے گی۔ اور حضرت سلیمان نے ملکہ سبا کو مرعوب کرنے کے لیے جو طریقہ اپنایا وہ زمانے کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ جیسے فرعون کے زمانے میں مبہوت کر دینے والی مہارتوں کا غُلغلہ تھا تو اسی لحاظ سے حضرت موسیٰ کو معجزے دیے گئے۔ اسی طرح ملکہ سبا کا زمانہ فنِ تعمیرات، نئی صنعت اور طاقت ور لشکروں کا زمانہ تھا۔ اور اسی پہلو سے انھیں مرعوب کیا گیا۔

آج کے دور میں اگر کسی قوم نے ایک سوپر پاور پر اپنی برتری دکھانی ہو تو اسے ثابت کرنا ہو گا کہ اس کے پاس اس سے زیادہ جدید ٹکنالوجی، زیادہ طاقتور فوج اور زیادہ طاقت ور کرنسی ہے۔ ایک سوپر پاور کا صدر اگر مقابلے کے کسی ایسے ملک کا دورہ کرے گا تو اس کے ساتھ فلسفیانہ مباحث، تبلیغی گفتگو اور علمی محاضرات نہیں کیے جائیں گے بلکہ اس کو دکھایا جائے گا ہمارے پاس ایسی قوتیں، ایسی صنعتیں، ایسی ایجادات واختراعات ہیں جن کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ اور اگر یہ مقابلہ جنگ کے بغیر جیتنا ہو تو وہی کچھ کرنا ہو گا جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے مقابلے میں کیا تھا۔ انھوں نے ملکہ کو، اللہ کے کرم اور عنایت سے، اپنے مقابلے میں دیہاتی اور بہت کمزور ثابت کر دیا تھا۔

چنانچہ ملکہ سبا نے سورج پرستی کو ترک کر کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت سلیمان کی سیاسی بالادستی بھی قبول کر لی۔ اور حضرت سلیمان نے اسے اپنی مملکت کی ملکہ برقرار رکھا۔ اسے ناقص العقل اور حکومت کے لیے ناموزوں قرار دے کر اقتدار چھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔ نہ ہی جھوٹی روایات کے مطابق ان سے شادی رچائی بلکہ تاریخی حقائق تصدیق کرتے ہیں ملکہ نے اس کے بعد کئی برسوں تک حکمرانی کی۔ ایک روایت کے مطابق چار برس اور دوسری روایت کے مطابق کئی برس۔ اور اس دوران ملکہ کو کئی نئی صنعتوں اور کاشت کے مفید طریقوں سے آگاہی دی۔

ملکہ سبا کا اصل نام تاریخ میں بیان نہیں ہوا۔ بعض مفسرین نے ان کا نام "بلقیس" بیان کیا ہے لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ اس کی تفصیل بی بی سی اردو کے مقالہ نگار وقار مصطفٰی نے "انفار گیٹ ایبل کوینز آف اسلام" کے حوالے یہ بتائی ہے کہ تورات کا یونانی زبان میں ترجمہ ہوا تو مترجم نے ملکہ سبا کے حضرت سلیمان کے سامنے پیش ہونے اور ان کے مرعوبانہ اور عقیدت مندانہ گفتگو کے انداز کو پسند نہیں کیا۔ اس کے خیال میں ان کا رویہ ایک ملکہ کے شایانِ

شان نہیں تھا بلکہ کسی بے کردار اور غلام عورت کا سا تھا۔ اس لیے اس احمق نے ان کے لیے یونانی لفظ "پلاکیس" استعمال کیا جس کے لغوی معنی "فاحشہ اور بد کردار عورت" کے ہیں۔ یونانی لفظ کا عربی میں ترجمہ ہوا تو عربی مترجم نے خیال کیا کہ یہ ملکہ کا نام یعنی اسم معرفہ ہے اور لفظ کو معرب کرتے ہوئے "بلقیس" بنا دیا۔ اور یہیں سے تمام مفسرین نے ان کی تقلید کی۔ نہ صرف عربی میں بلکہ فارسی اور اردو میں بھی یہ نام عام ہو گیا۔ ظلم تو یہ ہے کہ برصغیر میں لوگ بے دھڑک اپنی بچیوں کا نام بلقیس رکھ دیتے ہیں جو بہت ہی نامناسب ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہدہد کے بطور قاصد کا ذکر قرآن میں تو موجود ہے لیکن بائبل، عہد عتیق، سلاطین، تواریخ اور تالمود میں اس پرندے کا بطور قاصد ذکر موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہدہد اسرائیل کا قومی پرندہ ہے اور اسے یہودیوں میں بہت عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا گوشت کھانا اور شکار حرام سمجھا جاتا ہے۔

وجیہہ حسان واحدی

کوڈنگ اور ڈیجیٹل اسکلز کے ذریعے امکانات کو کھولیے

اس سلسلہ تحریر میں ہم صالحات کے لیے ایسے ہنر کا تعارف کرائیں گے جن کے ذریعے سے وہ گھر بیٹھے آن لائن آمدنی کے ذرائع پیدا کر سکتی ہیں۔ قارئین اس حوالے سے اپنے تجربات اور مشوروں سے ہمیں آگاہ کر سکتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون ان صالحات کے لیے ہے جو کمپیوٹر لٹریٹ ہیں اور اس میڈیا سے اپنی سکلز کو استعمال کرنے میں سہولت محسوس کرتی ہیں۔

"کیا صرف ڈاکٹر یا ٹیچر بننے کے آپشنز ہیں؟ بینکنگ پڑھی تو بینک میں مردوں کے ساتھ بہت ملنا جلنا ہو گا۔ لائیر بنی تو کورٹ کچھیری کے ہر وقت کے چکر۔ نرس تو نرس ہوتی ہے، ہسپتال میں دوسروں کے کام کرتے رہو۔ ہوم اکونومکس اچھا آپشن ہے"۔

لڑکیوں کو زندگی میں کیا کرنا ہے، کیا پڑھنا ہے، کیا کریئر بنانا ہے؟ کیا آج ہماری سوچ اس سوچ سے بہتر ہے؟ یقیناً! میں تو پاکستان کا حال ہی بتا سکتی ہوں۔ آج سے پچیس سال پہلے جب میں کالج میں تھی تو میرے ساتھ کی لڑکیاں مختلف قسم کے کورسز پڑھ رہی تھیں، جیسے بزنس اور فائنانس، کامرس، انجینئرنگ، لٹریچر، ڈاکٹری، نرسنگ، ڈنٹسٹری۔۔ لیکن آپشنز پھر بھی محدود تھے۔

آج دنیا بہت آگے آ گئی ہے، کریئر آپشنز کی بھرمار موجود ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود کیا پاکستان میں صنفی

تفاوت ابھی بھی پوری قوت کے ساتھ برقرار ہے؟ بے شک! کیونکہ میں جس طبقے کی بات کر رہی ہوں وہ پورے ملک کی آبادی کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ اس بات کو پوری قوم سے منوانا ہے کہ لڑکی کا خود مختار ہونا کتنا اہم ہے اور وقت اور آج کی دنیا کی ناگزیر ضرورت ہے۔

اس بات کو جان کر دل کو خوشی ہوتی ہے کہ آج، چھوٹے پیمانے پر ہی سہی لیکن، خواتین ایک دوسرے کو اِمپاور کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔ رول ماڈلز بن رہی ہیں۔ آزادی کی امید دے رہی ہیں۔

آج میں آپ کے ساتھ کوڈنگ سیکھنے کے آپشن کے بارے میں بات کروں گی، جس کی مہارتیں حاصل کرنے کی ترغیب دے کر، پاکستان جیسے ملک میں صنفی تفاوت کی خلا کو پُر کرنے میں ایک بڑھتا ہوا قدم ہے۔ یہ قدم لڑکیوں کو آزادی اور روزگار حاصل کرنے میں فروغ دے گا۔

کوڈنگ کیا ہے؟

کوڈنگ، جسے کمپیوٹر پروگرامنگ بھی کہا جاتا ہے، ان ہدایات کو ڈیزائن کرنے، لکھنے، جانچنے اور برقرار رکھنے کا عمل ہے جن کی پیروی ایک کمپیوٹر کسی مخصوص کام کو انجام دینے کے لیے کرتا ہے۔ یہ ہدایات جنہیں "کوڈ" کہا جاتا ہے، ایک یا ایک سے زائد پروگرامنگ زبانوں میں لکھی جاتی ہیں۔ جیسے کہ پائیتھون، جاوا یا جاوا سکرپٹ۔ یہ سب سافٹ ویئرز، آپس، ویب سائٹس اور دوسرے ڈیجیٹل مصنوعات کو تخلیق کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ کوڈنگ ڈیجیٹل دنیا کی بنیاد ہے۔ اس کو مختلف صنعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے ٹیکنالوجی اور فائنانس سے لے کر، صحت کی دیکھ بھال اور تعلیم تک۔ کوڈنگ سیکھ کر، افراد اختراعی حل تخلیق کرنے، نئے آئیڈیاز کو زندگی میں لانے کے لیے درکار مہارت اور علم حاصل کر سکتے ہیں۔

رکاوٹیں توڑیے

سماجی اصول اور وسائل تک محدود رسائی، اکثر ایس-ٹی-ای-ایم شعبوں میں لڑکیوں کی شرکت میں رکاوٹ بنتی ہے۔ ان چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے ماہرین تعلیم، پالیسی سازوں اور کمیونٹی لیڈروں کی اجتماعی کوشش کی ضرورت ہے۔ مواقع اور مدد فراہم کر کے، ہم لڑکیوں کو ٹیکنالوجی میں کیریئر بنانے کے لیے بااختیار بنا سکتے ہیں۔

کوڈنگ اور ڈیجیٹل سکلز کے فوائد

کوڈنگ اور ڈیجیٹل مہارتوں کا حصول لڑکیوں کی زندگیوں پر ایک بڑی تبدیلی کا اثر ڈال سکتا ہے۔ یہ مہارتیں نیٹ

ورکنگ کے مواقع کو بڑھاتی ہیں، کیریئر بنانے کے بہت سے دروازے کھولتی ہیں، مسائل حل کرنے کی صلاحیتیں بڑھاتی ہیں۔

اقدامات اور وسائل

کوڈ گرلز پاکستان جیسی تنظیمیں کوڈنگ بوٹ کیمپس، رہنمائی، تربیت، اور نیٹ ورکنگ کے مواقع پیش کرتی ہیں۔ یہ اقدامات لڑکیوں کو کوڈنگ اور ڈیجیٹل مہارتوں کو دریافت کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم فراہم کرتے ہیں۔ لڑکیاں باآسانی ان بوٹ کیمپس میں حصہ لے کر بہت کچھ سیکھ کر اپنے آنے والے کل کو بدل کو سکتی ہیں۔

آن لائن وسائل

لڑکیاں کو کوڈنگ اور ڈیجیٹل مہارتیں سیکھنے کے لیے مختلف آن لائن پلیٹ فارمز پر جا کر اپنے آپشنز دیکھنے چاہییں، جیسے

- کوڈاکیڈمی
- فری کوڈکیمپ
- گرلز ہو کوڈ

اے آئی کی مدد سے بنائی گئی خیالی تصویر

کامیابی کی کہانیاں

ٹیکنالوجی میں پاکستانی خواتین کی متاثر کن کہانیاں، کامیابی کی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جہان آرا، پی@ایس ایچ اے کی صدر، عنوویٹ کی بانی سلیمہ ویلانی، "وومن ان ٹیک پی کے" کی بانی فائزہ یوسف اور "سرکل" کی بانی صدف عابد، آنے والی نسلوں کے لیے راہ ہموار کرنے والے ٹریل بلزرز ہیں۔

فائزہ یوسف

ایک وقت تھا جب فائزہ جس کمپنی میں کام کرتی تھیں وہاں وہ واحد خاتون تھیں جو ایک ٹیک امپلوئی کے عہدے پر تھیں۔ بس انھوں نے ٹھان لی کہ وہ اور خواتین کو اُس جیسی تنہائی کا احساس کبھی نہیں ہونے دیں گی۔ جینن ٹیک میں سینئر پروڈکٹ مینیجر کے طور پر، وومن ان ٹیک پی کے کی بانی، کوڈ گرلز کی شریک بانی، اور "کاٹرپل ہرس" کی پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز، فائزہ، خواتین کو ٹیک میں بااختیار بنارہی ہیں اور اس شعبے میں داخل ہونے کے لیے مزید دروازے کھول رہی ہیں۔

انھوں نے ۲۰۱۶ میں وومن ان ٹیک پی کے کی بنیاد رکھی۔ اس کو ایک ایسی محفوظ کمیونٹی بنایا ہے جہاں خواتین ممبران پیشہ ورانہ مدد، کام اور کریئر سے متعلق مشورے اور سرپرستی حاصل کرسکتی ہیں۔ آج وہاں دس ہزار سے زائد خواتین اپنے آپ کو بااختیار بنانے اور ٹیک کی فیلڈ میں آگے جانے کا خواب پورا کررہی ہیں۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ فائزہ کو بچپن سے ڈسلیک سیا ہے! لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کے لیے دیگر شعبوں کا مطالعہ کرنا نسبتاً مشکل تھا، لیکن کمپیوٹر یا پروگرامنگ کی زبانوں کو سمجھنا فطری طور پر آیا! اس بات سے ان لڑکیوں کو کتنی ہمت اور امید ملے گی جو کسی بھی قسم کی سیکھنے کی معذوری کا سن کر یا تو خود یہ سمجھتی ہیں یا پھر معاشرہ ان کو یقین دلادیتا ہے کہ ان کا مستقبل باورچی خانے میں کھانا پکانے اور بچے پیدا کرنے سے زیادہ نہیں ہے! غلط سراسر غلط۔

کوڈ گرلز

فائزہ کا کہنا ہے کہ "ہمارے پاس متوسط سے کم آمدنی والے خاندانوں کی بہت سی لڑکیاں ہیں جو کوڈ گرلز میں حصہ

لیتی ہیں۔ جب کوئی لڑکی وہاں کے پروگرام سے فارغ ہوتی ہے، تو ہم اسے ٹیک انڈسٹری میں نوکری دلواتے ہیں۔ زیادہ تر معاملات میں، یہ ان کے خاندان کی آمدنی کو دوگنا کر دیتا ہے۔ ان پروگراموں کی وجہ سے ہم نے خواتین کو گاڑیاں خریدنے، مکان خریدنے اور اپنے بچوں کو بہتر اسکولوں میں داخل کرانے کے قابل ہوتے دیکھا ہے۔"

فائزہ سمجھتی ہیں کہ ٹیک انڈسٹری میں متنوع لوگوں کی اور ان کی آوازوں کی ابھی بھی بہت کمی ہے۔ وہ اس فیلڈ میں صرف خواتین ہی نہیں بلکہ ٹرانس لوگ، مختلف صلاحیتوں کے حامل افراد اور ایسے لوگ دیکھنا چاہتی ہیں جو نیورو ٹیپ یکل نہ ہوں۔

صدف عابد

اس فیلڈ میں لڑکیوں کو ہمت دلانے کی ایک اور شاندار مثال صدف عابد، سرکل کی بانی، ڈیجیٹل لٹرسی اور انٹرپرینیورشپ کے ذریعے پاکستان میں خواتین کو بااختیار بنانے میں ایک ٹریل بلزر ہیں۔ ان کا سفر خواتین کی صلاحیتوں اور ان کے لیے دستیاب مواقع کے درمیان فرق کو ختم کرنے کے وژن کے ساتھ شروع ہوا۔ اس خواب کی تعمیر انہوں نے اپنے گھر سے شروع کی۔ بلکہ ان کے کہنے کے مطابق اپنی کھانے کی میز سے شروع کی۔ سماجی اصولوں اور محدود وسائل کا سامنا کرنے کے باوجود، صدف نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ یہ ثابت قدمی انھوں نے اپنے والدین اور ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسرز سے سیکھی۔ انسان کی تربیت میں والدین کے بعد، ٹیچرز کا سب سے اہم ترین رول ہوتا ہے۔ صدف نے گراجوئیشن کے بعد ٹھان لی تھی کی بس عورتوں کے لیے کچھ کرنا ہے۔

صدف نے ۲۰۱۸ء میں سرکل قائم کیا، جس میں انھوں نے اس بات پر توجہ دی کہ خواتین کو یہاں وہ آپشنز میسر ہوں جو عام تور پر انھیں کہیں اور میسر نہیں ہیں۔

"صدف کا کہنا ہے کہ ہمارا وژن یہی ہے کہ ہم عورت کے لیے ایک "گو ٹو پلاٹ فورم" بن جائیں۔ اگر اس کو کاروبار شروع کرنا ہے وہ کوڈ گرلز کا سوچے، اگر وہ کام کی طرف جانا چاہتی ہے۔۔۔ لیڈرشپ میں آگے بڑھنا چاہتی ہے تب بھی وہ کوڈ گرلز کا سوچے۔

ہم ایک مضبوط فیملی، ایک مضبوط ملک تبھی بنا سکتے ہیں جب ہم اکھٹے مل کر ایک دوسرے کے قابلیت کو موقع دیں۔۔۔ میری اپنی زندگی میں میرے والد کا بہت اہم رول رہا ہے، انھوں نے ہمیشہ مجھے انکریج کیا۔"

سر کل کے ذریعے، صدف نے روایتی حدود کو پامال کرتے ہوئے خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے ابھی اور بہت آگے جانا ہے۔ انھوں نے اپنے اثرات کو بڑھانے کے لیے اقوام متحدہ کی خواتین، گوگل اور فیس بک جیسی تنظیموں کے ساتھ کام کیا ہے۔ صدف کی کوششوں نے زندگیوں کو بدل دیا ہے، خواتین کو تعلیم، روزگار اور معاشی آزادی تک رسائی کے قابل بنایا ہے۔ ان کی لگن کو اشوکا فیلوشپ اور پاکستان انٹرپرینیورشپ ایکو سسٹم ایوارڈ کے ذریعہ پہچان ملی ہے۔ صدف کی کہانی خواتین اور پسماندہ کمیونٹیز کو بااختیار بنانے کے عزم کی گواہی کے طور پر کام کرتی ہے۔

رکاوٹوں پر قابو پائیں

لڑکیوں کو بااختیار بنانے کے لیے، ہمیں کلیدی چیلنجوں سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔ خاندانی تعاون اور حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔ تحریک میں شامل ہوں۔ لڑکیوں کو کوڈنگ اور ڈیجیٹل مہارتیں دریافت کرنے کی ترغیب دیں۔ مدد، وسائل، اور رہنمائی فراہم کریں۔ سوچ کو بدلنے میں وقت لگتا ہے۔ چلیں سوچ کو بدلیں!!!

کلثوم ثاقب

زندگی، آزمائش اور حقیقی سکون

ہم سب کیا چاہتے ہیں؟

ہر انسان فطری طور پر سکون، خوشی، اور اطمینان کی تلاش میں ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ ایک بار ہماری کچھ خواہشات پوری ہو جائیں تو ہماری زندگی میں ہمیشہ کے لیے خوشی اور راحت آجائے گی۔

- "بس نوکری لگ جائے، پھر زندگی آسان ہو جائے گی۔"
- "بس شادی ہو جائے، تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
- "بس گھر بن جائے، بچے بڑے ہو جائیں، ویزا لگ جائے، پروموشن ہو جائے... پھر سکون ہی سکون ہو گا!"

لیکن کیا ایسا ہوتا ہے؟ کیا واقعی کوئی مقام ایسا آتا ہے جہاں تمام پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں؟

حقیقت یہ ہے: ہر ایک منزل کے بعد ایک اور آزمائش کھڑی ہوتی ہے۔ یہ دنیا کسی بھی انسان کو مکمل اور دائمی سکون دینے کے لیے نہیں بنی!

قرآنی بصیرت - اللہ کے محبوب بندے بھی آزمائش میں

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے سب سے زیادہ محبوب تھے، یعنی انبیاء کرام، ان میں سے کسی کی زندگی بھی سکون اور راحت کا نمونہ نہیں تھی۔

- آدمؑ—جنت میں آرام کے بعد دنیا میں آزمائشوں کا سامنا، بیٹے کے ہاتھوں بیٹے کا قتل
- نوحؑ—950 سال کی تبلیغ، نافرمان قوم، اپنے بیٹے اور بیوی کی نافرمانی کا صدمہ
- ابراہیمؑ—باپ اور قوم کی مخالفت، آگ میں ڈالے گئے، بیٹے کی قربانی کے امتحان میں ڈالے گئے
- یوسفؑ—بھائیوں کی سازش، غلامی، قید، اور پھر بادشاہت کا امتحان
- موسیٰؑ—فرعون کے ظلم، بنی اسرائیل کی سرکشی، مسلسل ہجرتیں
- عیسیٰؑ —اپنی ہی قوم کی طرف سے جھٹلایا جانا، قتل کی سازش
- محمد ﷺ—طائف میں پتھر کھائے، شعب ابی طالب میں تین سال محصور رہے، اہلِ مکہ کی دشمنی سہی

یہ تمام ہستیاں اللہ کے نزدیک محبوب ترین تھیں، لیکن کیا ان میں سے کسی کی زندگی ہمیشہ کے لیے سکون میں گزری؟

نہیں! کیونکہ یہ دنیا مکمل سکون کے لیے نہیں، بلکہ آزمائش کے لیے بنائی گئی ہے۔

زندگی—ایک کشتی کا سفر

زندگی ایک متحرک کشتی کی مانند ہے:

- کبھی طوفان آتے ہیں، کبھی سکون کے لمحے ملتے ہیں۔
- ہمارا کام اپنی کشتی کے رخ کو درست سمت میں رکھنا ہے۔
- اگر ہم غافل ہو گئے، تو یہ کشتی حق کی راہ سے بہک کر غلط سمت میں چلی جائے گی۔

آزمائشوں کا فلسفہ—ہم کیوں آزمائے جاتے ہیں؟

ہم اکثر اللہ سے دعا کرتے ہیں:

- "یا اللہ، میری ساری پریشانیاں دور کر دے!"
- "زندگی آسان بنا دے، سب مسائل ختم ہو جائیں!"

لیکن جب ہم نماز، زکوٰۃ، صدقہ و خیرات سب کچھ کرنے کے باوجود مشکلات کا سامنا کرتے ہیں تو دل میں سوال اٹھتا ہے:

"میں نے تو سب کچھ ٹھیک کیا، پھر بھی میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟"

یہاں قرآن ہمیں سکھاتا ہے:

"أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ؟" (العنکبوت: 2)

"کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ بس یہ کہہ کر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے، اور ان کی آزمائش نہیں ہو گی؟

اصل کامیابی کیا ہے؟

- آزمائشوں کو قبول کرنا، ان سے سیکھنا، اور صبر کے ساتھ آگے بڑھنا۔
- اللہ پر بھروسہ رکھنا، دعا اور استقامت کے ساتھ زندگی گزارنا۔
- یہ سمجھنا کہ دنیا میں ہر امتحان ہمیں بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے آتا ہے۔

دنیا میں سکون کیسے حاصل ہو؟

یہ دنیا محض دکھوں کا گھر نہیں، یہاں سکون بھی ہے، مگر اس کا دار و مدار ہماری سوچ پر ہے۔

حقیقی سکون ان چیزوں میں ہے:

- اللہ کی رضا میں سکون—جو کچھ ملے، اس پر شکر، جو نہ ملے اس پر صبر
- حق پر استقامت میں سکون—آزمائشوں میں ثابت قدمی اور ایمان
- نیت کی درستگی میں سکون—دنیاوی فائدے کے بجائے اللہ کی رضا کو ترجیح دینا

جیسا کہ سورۃ العصر میں فرمایا گیا:

"وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"

"حق پر قائم رہو اور صبر کی تلقین کرو۔

نتیجہ—ہمیں کیا سیکھنا چاہیے؟

- یہ دنیا آرام کی جگہ نہیں، بلکہ جد و جہد کی جگہ ہے۔
- مسلمان کا مقصد آزمائشوں سے فرار نہیں، بلکہ ان کا سامنا کرنا ہے۔
- حقیقی کامیابی ان مشکلات کو صبر، استقامت اور ایمان کے ساتھ گزارنے میں ہے۔

قرآنی بصیرت

- دنیا میں سکون کا حقیقی راز—اللہ کی رضا، حق پر استقامت، اور آخرت پر یقین۔

زندگی میں مشکلات آئیں گی، آزمائشیں بڑھیں گی، لیکن جو اپنی کشتی کا رخ درست رکھے گا، وہی منزل پر پہنچے گا۔

تحریر: ڈاکٹر سیمین معین الدین
ترجمہ: وجیہہ حسان واحدی

اکیبانہ: ایک قدیم روحانی فن!

ایک ایسی دنیا کا تصور کریں جہاں فطرت اور آرٹ بغیر کسی رکاوٹ کے آپس میں گھل مل جاتے ہیں، جذبات کو ابھارتے ہیں اور تخلیقی صلاحیتوں کو متاثر کرتے ہیں۔ رب کی بنائی ہوئی اس بے عیب اور حسین دنیا سے لیے گئے کچھ عناصر کے ملاپ کی دنیا۔ اکیبانہ کی دنیا، ایک ایسی ہی دنیا ہے! جاپان میں پھولوں کو ایک غیر معمولی انداز سے ارینج کرنے کا روایتی فن۔

اکیبانہ صدیوں سے جاپانی ثقافت کا سنگ بنیاد رہا ہے۔ ایک زندہ فن۔ کلاسیکل جاپانی فنون کی تطہیر کا حصہ۔ جس میں کوڈو، بخور کی مہک کی خوبصورتی کو پہچاننا اور چاڈو فر چائے اور اس کی تقریب شامل ہیں۔

اکیبانہ کی ایک مختصر تاریخ

اکیبانہ کا آغاز چھٹی صدی میں تب ہوا جب بدھ مت کے پجاری دیوتاؤں کو نذرانے کے طور پر پھول چڑھاتے تھے۔ جاپانی اسکول "اکینوبو" اس فن کا سب سے قدیم اور سب سے بڑا ادارہ ہے۔ لفظی معنوں میں اکینوبو "تالاب کے کنارے ایک پادری کا گھر" ہے! وقت گزرنے کے ساتھ، عقیدت کا یہ سادہ عمل شنٹوازم، تاؤازم اور جاپانی جمالیات سے متاثر ہو کر، ایک نفیس آرٹ کی شکل میں بدل گیا۔ لفظ "اکیبانہ" کا مطلب "زندہ پھول" ہے۔

اکیبانہ کا فن سکھانے کا پہلا جدید اسکول انیسویں صدی میں قائم ہوا اور اب دیکھیں! جاپان میں تین ہزار سے بھی زائد اسکول ہیں۔

اس فن کی روح کیا ہے؟ پھولوں کی خوبصورتی اور میرے دل میں آرزو کا خوبصورت اظہار۔ فطرت کی قوتوں سے آگہی کا اظہار، جس کے ساتھ میرے ارد گرد کے پیڑ پودے ایک پرکشش ہم آہنگی میں رہتے ہیں۔

عام طور پر ایک اکیبانہ کے اریجمنٹ میں تین اہم عناصر ہوتے ہیں:

- شن یا پرائمری، جو جنت کی نمائندگی کرتا ہے۔
- سوئے یا سکنڈری، جو زمین کی نمائندگی کرتا ہے۔
- ہک-آئے یا ٹرشری، جو آدمی کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس طرح اکیبانہ کے گلدستوں میں ان تینوں عناصر کے درمیان ایک رشتہ ظاہر ہوتا ہے! ان گلدستوں میں عام طور پر جو اشیاء استعمال ہوتی ہیں ان میں پھول، پتے، ٹہنیاں، گھاس اور یہاں تک کہ پھل بھی ہیں۔ گلدان جیسا بھی ہو، اس پورے اریجمنٹ کا ایک اہم عنصر ہوتا ہے۔ گلدستے کے اندر اور اس کے ارد گرد جو خالی یا منفی جگہ ہوتی ہے، وہ بھی اس اریجمنٹ کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کی خوبصورتی ویسی ہی ہے جیسے ایک میوزیکل اسکور میں خاموشی کی ہوتی ہے۔

میرا نام ڈاکٹر سیمین معین الدین ہے۔ اکیبانہ میری زندگی ہے! میں جاپان کے سوگیٹ سو اسکول سے "جونین سومو" ہوں۔

میں نے اپنے پھولوں کے سفر کا آغاز ۱۹۹۰ء میں سنگاپور سوگیٹ سو ایسوسی ایشن کے ساتھ، مسز کازوکاٹوکم، بانی صدر کے زیرِ سرپرستی کیا۔ ہمیشہ سے پھولوں کی کشش نے مجھے ایک عجیب انداز میں متاثر رکھا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ اس دنیا میں پھول ہم سب کے لیے خدا کا ایک غیر معمولی تحفہ ہیں! اکیبانہ کے خوبصورت گلدستوں میں انہیں ایک

الگ پہچان دینے کا طریقہ ہے۔ اس فن کو سیکھنا میرے لیے ایک نعمت ہے اور میں اس کے لیے بہت شکر گزار ہوں۔

اکیبانہ ایک متاثر کن آرٹ فارم ہے۔ یہ وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ آج جو کلی ہے، کل وہ کھلے گی! یہ کھلنا اس ترتیب کی شکل کو بدل کر اسے ایک نئی ڈائمنشن دیتا ہے! ہر ارینجمنٹ میں ایک نئی کہانی ہے اور اس داستان کو نقل نہیں کیا جا سکتا۔ میرے لیے اکیبانہ کی مشق میری روح کے لیے غذا ہے، جیسے مراقبہ! میرے ہاتھ سے بنا ہوا ہر گلدستہ مجھے ایک نئی کامیابی اور سکون کا عظیم احساس دیتا ہے! پھولوں کی خوبصورتی کو ہر انسان محسوس کر سکتا ہے، اس طرح اکیبانہ کا فن ہر انسان سیکھ سکتا ہے۔

یہ تخلیقی صلاحیتوں، ذہن سازی اور جذباتی توازن کا ایک گیٹ وے ہے۔ جیسا کہ ہم جدید زندگی کی پیچیدگیوں کو ڈوج کرتے ہیں، اکیبانہ کی لازوال حکمت فطرت اور خود کے ساتھ ہم آہنگی میں رہنے کی اہمیت کی یاددہانی پیش کرتا ہے۔

اکیبانہ کے اصولوں اور طریقوں کو اسلامی روحانیت کی نظر سے دیکھیں تو ایک دلچسپ تشریح کی جا سکتی ہے۔ اکیبانہ میں سادگی اور اتحاد پر زور، توحید کے تصور کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں پھولوں اور شاخوں کے توازن اور ہم آہنگی کا احساس تمام مخلوقات کے باہمی ربط کا آئینہ دار ہے۔

اکیبانہ میں شامل نرمی محبت، ہمدردی اور ذہن مندی کے اقدار کو جنم دیتی ہیں۔ یہی وہ عقائد اور اقدار ہیں جو ہمیں قدرتی دنیا کے ساتھ مہربانی اور اس کی دیکھ بھال میں مدد کرتے ہیں۔

اس تخلیقی عمل کے ذریعے، اکیبانہ تزکیہ کے تصور پر زور دیتا ہے۔ پریکٹیشنر کے خیالات، جذبات اور ارادوں کی تطہیر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے، اکیبانہ اسلامی روحانیت، تخلیقی صلاحیتوں اور فطرت کے دھاگوں کو ایک ساتھ باندھتے ہوئے، ایک مقدس رسم بن جاتی ہے۔

چاہے آپ فنکار ہوں، فطرت کے عاشق، یا محض سکون کے تلاش میں گھومتے ہوئے ایک فرد، اکیبانہ آپ کو خود کی دریافت کے سفر پر جانے کی دعوت دیتا ہے۔ تو چلو آؤ، کچھ پھول جمع کریں اور اکیبانہ کے قدیم فن سے اپنی زندگی کو مزید متوازن، خوبصورت اور بامعنی کرنے کی رہنمائی پائیں۔

اقصیٰ گیلانی

لاپتہ جینڈر

چولہے پہ چاول چڑھاتی ہوئی عورتیں
جن کے چہروں کا سارا حسن، دلکشی
گرم چولہے سے اٹھتی تپش کی نذر ہو گئی
گاؤں کی بچیاں جن کے بھائی پرائیویٹ کالج میں پڑھتے رہے

اور انہیں پانچویں تک پڑھا کر سلائی کڑھائی سکھائی گئی
قتل بیٹا کرے ڈنڈ بیٹی بھرے
وہ جنہیں دس برس کی عمر میں بیاہا گیا
جن کو پردے میں بھی نوچا، کھایا گیا

جن کو مر کے بھی سکھ نہ میسر ہوا
جن کا مردا قبر سے نکالا گیا
جو ہمیشہ ہی تسکیں کا ذریعہ بنیں
بہکی ہوئی ناسمجھ بچیاں

صالحات مشاعرہ

جن کی لاشوں کو کوڑے کے ڈھیروں پہ پھینکا گیا
داغی اور پھولے بدن والیاں
جن کی ساری نزاکت نئے پھول جننے میں ضائع ہوئی
جنہیں گولڈ میڈل ملے نوکری کی اجازت نہیں

جنہیں بعد مرنے کے ستھرا کفن تو ملے
ماہواری کے دوران کپڑا نہیں
وہ کپاس کے بیج بوتی ہوئی حور عورت
وہ مل کی مشینوں پہ جھکتی ہوئی کوئی مزدور عورت

جس کی پسینے میں بھیگی ہوئی چھاتیاں
تیز نظروں کی چھریوں سے کاٹی گئیں
جس کے شوہر نے دوجا بیاہ کر لیا اور وہ زندگی روز مر مر کے جیتی رہی
جس نے شوہر کو بھرپور جنسی آسودگی تو عطا کی مگر اس کو اولاد کا تحفہ نہ دے سکی

بانجھ ہونے کا احساس جس کی رگوں کو زہر بن کے کھاتا رہا
جو ساس کو اس لیے نہ جچی کے جہیز اس کا کم تھا
جس کے شوہر نے کونڈم کے پیسے بچا کر اسے بارہ بچوں کا ریوڑ دیا
وہ بھوکی پیاسی عمر بھر وہ ریوڑ چَراتی رہی اور بکھرتی رہی

جس کا محبوب وعدے نبھا نہ سکا
جس نے ابا کی مرضی سے زندہ بدن اس سوداگر کو سونپا
جسے زندہ مردہ سے تھا کوئی مطلب نہ کوئی غرض تھی
وہ اس کے لیے پالتو جانور تھی

صالحات مشاعرہ

جس نے بچوں کی خاطر اک اجنبی سے گزارا کیا
جس نے وٹے میں بیاہے ہوئے بھائی کی شادمانی کی خاطر
ہمیشہ مظالم سہے، چپ کا روزہ رکھا
اور بھائی نے بیوی کی باتوں میں آکر کبھی جس کو ہنس کر بھی دیکھا نہیں

جس کے ابا نے بیٹے کی خواہش میں چھے بیٹیاں پیدا کیں
اور چھ بیٹیوں کی وراثت بھی بیٹے کی جیبوں میں ڈالی
جو اسپتالوں میں سرکاری نرسوں سے سو گالیاں کھا کے چپ چاپ بستر پہ لیٹی رہیں
جنہیں پرائیویٹ سکولوں نے چھ چھ ہزاروں پہ نوکر رکھا

جن کو اجرت، گواہی وراثت میں تو حصہ آدھا ملا
مگر زندگی کی پٹاری سے نکلے غموں کا مکمل وزن جن کو کاندھوں پہ لادا ملا
جن کے برقعے بدن کو چھپا نہ سکے
مغنیاں جن کو روٹی نچاتی رہی

وہ جو جنت میں بھی ایسا مال غنیمت ہیں جن کی پیشانی پہ باندی لکھا ہے
جھانسی کی رانیاں جو نسل کو بڑھانے میں الجھی رہیں
نہ بنیں فلسفی نہ نبی ہو سکیں
جو ہمیشہ سے ہیں اور کہیں بھی نہیں

ایسی سب عورتوں پہ کروڑوں سلام

تبصرہ نگار: وجیہہ حسان واحدی

کیا ہم زندہ ہیں

عنوان: کیا ہم زندہ ہیں نام کتاب: اردو

مصنفہ: علیزے نجف

صفحات: 240

قیمت: 399 انڈین روپے

ناشر: علیزے نجف

رابطہ: Alizey.najaf@gmail.com

کیازندگی صرف موت کے ساتھ ہی ختم ہو گی؟ لیکن اگر زندگی خود موت بن جائے؟ زندہ ہو کر بھی زندگی کی رنگینیوں کی قدر نہ کر پائیں۔ زندہ ہو کر بھی، ہر روز دل اور احساسات مردہ ہوں۔اور اگر فی الواقع نفسیاتی اور روحانی موت برپا ہو جائے تو اس کو زندہ کرنے کے لیے کیا اوزار استعمال کریں؟ یہ سب سوالات جتنے اہم آج کی دنیا میں ہیں، اتنے کبھی بھی نہیں تھے۔ علیزے نجف نے انہی سوالات اور کئی اور مسائل کا بہت اثر انگیز نسخہ اس کتاب کی صورت میں دیا ہے۔ یاد رہے یہاں موت کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔

علیزے کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں ہر عمر کے گروپ سے تعلق رکھنے والے لوگ زندہ ہو کر بھی اتنی تاریکی میں ہیں کہ وہاں سے زندگی کی طرف واپسی ناممکن لگتی ہے لیکن اصلاً ناممکن ہے نہیں۔ یہ تاریکی کئی راستوں

تعارفِ کتاب

سے امنڈ کر ہمیں گھیر سکتی ہے۔ علیزے نے تفصیل سے ایک ایک نفسیاتی مرض کی وضاحت کی ہے۔ ایک بہت اہم بات جو ہر زیر عنوان نظر آئی وہ یہ کہ کس طرح انسان کی نفسیات کا ہر پہلو، اس کی ذہنی صحت، اس کے بچپن میں والدین کی پرورش، اس کی عزت اور آبرو کی تعظیم، اس کے ارد گرد کے ماحول پر منحصر ہوتا ہے۔

علیزے نے جہاں نرگسیت میں مبتلا افراد کی تصویر کھینچتے ہوئے، اس مرض کی روک تھام کے تجاویز پیش کی ہیں، وہاں اس کے برعکس ٹاکسک پوزیٹیوٹی کے گہرے اثرات پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ کیا اقدام لینے چاہییں ؟ کہاں سے مدد لیں ؟ اکیلے موت جیسی تاریکی میں ان امراض سے لڑنا کوئی بہادری نہیں ہے، مدد لینا ناگزیر ہے !

مصنفہ نے ہر باب کے شروع میں اُس باب کے مسئلے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے دنیا کی مشہور شخصیات کا ایک گہرا قول شامل کر کے ایک بہت ہی منفرد اسلوب استعمال کیا ہے۔ مہاتما گاندھی، اوپرا ونفری، سن زو، نپولین بوناپارٹ وغیرہ چند نام ہیں جن کے اہم اقوال زندگی کو روشن بنانے میں انسان کی مدد کر سکتے ہیں، جو اس کتاب کا منفرد حصہ ہیں۔

مصنفہ نے ذہنی غربت کے تصور کی تفصیل کو بیان کرتے ہوئے توجہ دلائی ہے کہ کیسے یہ مرض انسان کے اندر کے پوٹنشل کو زنگ آلود کر دیتا ہے، کیسے اس کے اثرات نا صرف اُس پر بلکہ آگے آنے والی نسلوں پر بھی منفی اثر ڈال دیتے ہیں۔ اس سے نکلنے کے لیے کیوں ہمیں نئی مہارتیں اور کارآمد علم سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے ! یہاں پر اس حقیقت پر زور دیا جا سکتا تھا کہ ذہنی غربت حکومت کی طرف سے دستیاب ناکافی سہولیات، تعلیم اور وسائل کی وجہ سے بھی انسان کو گھیرے میں لے سکتی ہے۔ اس صورت میں انسان کی خود کی کوشش، خود ارادیت اور خود میں نظم و ضبط ڈھونڈنا اور اس کو برقرار رکھنا مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔

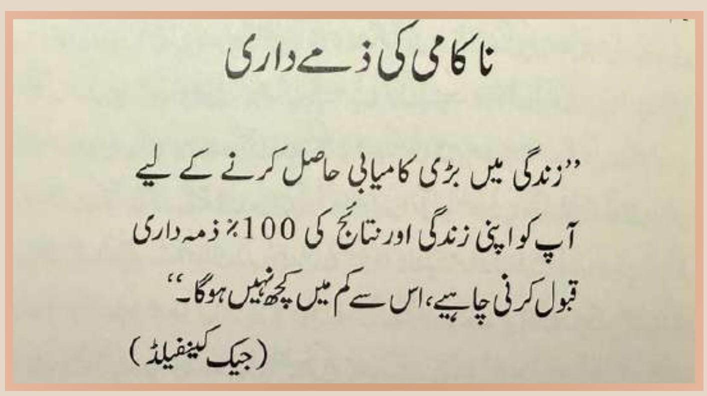
ناکامی کی ذمے داری

''زندگی میں بڑی کامیابی حاصل کرنے کے لیے آپ کو اپنی زندگی اور نتائج کی 100٪ ذمہ داری قبول کرنی چاہیے، اس سے کم میں کچھ نہیں ہوگا۔''

(جیک کینفیلڈ)

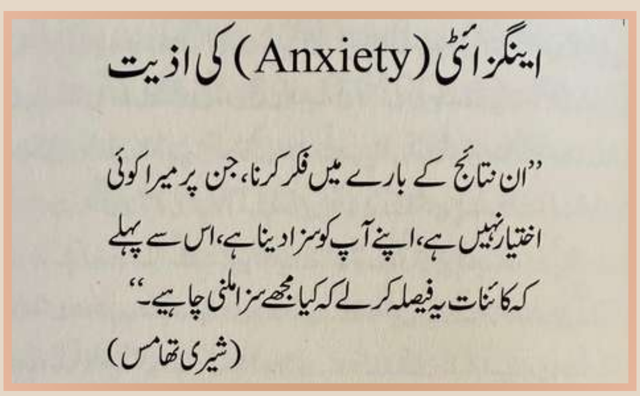
اینگزائٹی (Anxiety) کی اذیت

''ان نتائج کے بارے میں فکر کرنا، جن پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے، اپنے آپ کو سزا دینا ہے، اس سے پہلے کہ کائنات یہ فیصلہ کرلے کہ کیا مجھے سزا ملنی چاہیے۔''

(شیری تھامس)

اسی سے متعلق مصنفہ نے کم فرٹ زون کی قید کے باب میں اس مرض میں بندھے ہوئے انسان کی بالکل صحیح تصویر کھینچی ہے۔ اس معاملے پر فارا گرے کے قول نے مجھ پر گہرا اثر کیا کہ "کم فرٹ زون کامیابی کا دشمن ہے" !

تعارفِ کتاب

یہ باب خاص ان لوگوں کے لیئے پڑھنا ضروری ہے جو زندگی سے مایوس ہیں، مختلف قسم کے نتائج چاہتے ہیں، بڑی کامیابیوں کے حصول کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں لیکن یہ سب کچھ چاہنے کے باوجود کوئی تبدیلی آتی نظر میں نہیں۔
سوال بنتا ہے کیوں؟"

مصنفہ نے بے چینی، ڈپریشن، ناکامیوں سے نمٹنے کے سمیت کئی حساس موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ وہ اپنی کتاب کا اختتام اپنے لیے خوشی کے حصول، ذہن سازی اور شکر گزاری کے فوائد، روحانی ذہانت کو فروغ دینے کے متاثر کن اور حوصلہ افزا ابواب کے ساتھ کرتی ہے۔ اردو زبان میں خود آگہی کی شاید یہ پہلی کاوش ہے جو پڑھنے والے کو سوچنے پر آمادہ کرتی ہے کہ کیا ہم واقعی زندہ ہیں؟

ڈرامے پر تبصرہ

احتشام نبی

تن من نیل و نیل

پروڈیوسر: سلطانہ صدیقی

نشر: ہم ٹی وی

ہدایت کار: سیفی حسن

تحریر: مصطفی آفریدی

کاسٹ: سحر خان، شجاع اسد، نعمان مسود، نادیہ افغان، سمیعہ ممتا، عثمان جاوید۔

ڈرامے پر تبصرہ

اقساط پر مشتمل ڈرامہ سیریل "تن من نیل و نیل" ابھی حال ہی میں ہم ٹی وی پر نشر ہوا۔اس سیریل کو مصطفی آفریدی نے تصنیف کیا اور سیفی حسن نے اس کی ہدایت کاری کے فرائض انجام دیے۔ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے فن میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

پاکستان میں لکھاریوں کو اپنے ارد گرد سے موضوعات چننے کے لیے آزادی میسر نہیں ہے۔ معاشرے میں موجود مذہبی انتہا پسندی، عدم برداشت، سیاسی پولرائزیشن، اقلیتوں 'خواتین اور دیگر کمزور طبقات کے بارے میں رائج دینی تصورات اور معاشرے میں سچ جاننے کی جستجو کا فقدان، فنون لطیفہ کے اظہار کے مواقع کو بہت محدود کر دیتا ہے۔مزید یہ کہ فلم اور ٹی وی پر ریٹنگ کی دوڑ نے سچ کی عکاسی کرنے والے سنجیدہ مسائل کو پس پشت ڈال کر صرف رومانوی یا ساس بہو والے ڈرامے دکھانے کی روایت ڈال دی ہے۔ ایسے ماحول میں " تن من نیل و نیل " ہماری سماعتوں اور بصارتوں کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا ہے۔

ڈرامے کا پلاٹ رابی اور سونو کے مرکزی کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔ یہ کردار معاشرے میں موجود تضادات اور اخلاقی گراوٹوں کے درمیان اپنی بقاء کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ رابی ایک متوسط طبقے کے روایت پسند گھر میں رہتی ہے جو ایک روایتی محلہ میں آباد ہے۔اس کا چچازاد بھائی (کامی) اس کو پسند کرتا ہے جو اسی گھر میں رہتا ہے۔ سونو ایک بن باپ کا نوجوان ہے جو ایک ڈانس گروپ کا حصہ ہے۔ دونوں کردار سوشل میڈیا کے اس دور میں معاشی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا اتفاقی تعلق آہستہ آہستہ پسندیدگی اور پھر محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان نوجوانوں کے نئے زمانے کے رومانس کے متوازی ان کے والدین (رابی کا والد اور سونو کی والدہ) کی نوجوانی کے زمانے کی شناسائی بھی کہانی کا حصہ ہے۔ ولن کے کردار میں کامی، رابی اور سونو کے راستے میں روایتی روڑے اٹکاتا ہے۔ لیکن گلی محلے میں رہنے کے باوجود رابی کو ایک روشن خیال باپ، ماں اور تایا کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

ڈرامے کی کہانی میں رابی کی والدہ ایک ایسا کردار نبھاتی نظر آتی ہیں جو بظاہر دھیما ہونے کے باوجود اندر سے بہت مضبوط ہے۔ وہ اپنے خاوند کو یک طرفہ چاہنے اور اس کی خوشنودی کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کے باوجود، مشرقی رشتوں میں گندھی ہوئی روتی دھوتی کمزور روایتی ماں نہیں ہے۔ اسی طرح سونو کی والدہ بھی اپنے خوابوں کی تعبیر کا پیچھا کرتے ہوئے زمانے سے ٹکرا جانے والا کردار ہیں۔ تن من نیل و نیل کا طرہ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس کے کردار رونے دھونے کے بجائے زمانے کے جبر کا مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ڈرامے میں یہ سب کچھ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ اس ڈرامے کی کہانی سے معاشرے میں موجود کمزور طبقات (مثلاً خواتین) کو یہ مثبت پیغام ملتا ہے کہ حالات کا مقابلہ کرنا آخری فتح کا موجب بنتا ہے جبکہ استحصال کو برداشت کرنا استحصال کو شہہ دینے کا سبب بنتا ہے۔

ڈرامہ بہت سے ایسے ذیلی موضوعات کو بھی اٹھاتا ہے جن پر بات کرنا پاکستان میں شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے۔ ان میں ہم جنس پرستی پر مبنی ریپ، ڈانس کرنے والوں کے بارے میں متعصبانہ رویہ، سیاست میں کرائے کے غنڈوں کا استعمال اور مذہبی جنونیت پر مبنی ہجوم گردی کی بربریت وغیرہ شامل ہیں۔ کہانی کے مصنف نے ان حساس موضوعات کو ایسے پیرائے میں سپرد قلم کیا ہے کہ بات بھی کہہ دی ہے لیکن اس نظام کے محافظین کو اتنا ناراض نہیں ہونے دیا کہ ڈرامے کے عین درمیان میں اس کو بین ہونے جانے کے خطرات میں جھونک دیا جاتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو بہت سی فلموں اور ڈراموں کی طرح اس ڈرامے کا انجام بھی سرمد کھوسٹ کی فلم "زندگی تماشہ ہے" جیسا ہوتا۔

ڈرامے کی آخری قسط میں جب کامی، رابی اور سونو کے خلاف توہینِ مذہب کے جذبات بھڑکا کر ہجوم کو ان کے قتل پر امادہ کرتا ہے تو مجھے ایک لمحے کے لیے کہانی کا یہ موڑ غیر حقیقی محسوس ہوا۔ مجھے لگا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنا بڑا ہجوم ناحق ان معصوموں کے قتل کے درپے ہو جائے لیکن پھر مجھے اس سری لنکن مینجر کی یاد آئی جس کو مشین پر ایک اسٹکر اکھاڑنے کی پاداش میں ہجوم نے بھری سڑک پر جلا کر بھسم کر دیا۔ اس مینجر کو اس انجام سے دوچار کرنے والے لوگ (عمومی معنی میں) جرائم پیشہ افراد نہیں تھے بلکہ سڑک پر چلنے والے وہ عام لوگ تھے جو بظاہر شرافت کا لبادہ اوڑھے رکھتے ہیں لیکن درندگی میں بھیڑیا یا ہائینا بننے میں بالکل دیر نہیں لگاتے۔ پھر مجھے لاہور کی وہ خاتون یاد آ گئی جس کے لباس پر عربی کیلیگرافی تھی اور بھیڑیے اپنے "خود ساختہ مذہب" کی حفاظت کی غرض سے، اس کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر منظر بدلا اور مجھے وہ مسیحی دوڑتے نظر آئے جو جلتے ہوئے چرچ سے نکل کر ہجوم کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ ان جیسے بہت سے مناظر کو یاد کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ تن من نیل و نیل کی آخری قسط ہمارے معاشرے کے زندہ کرداروں پر مشتمل ہے۔ جگہ چاہے سیالکوٹ ہو، لاہور ہو، نارووال ہو، مردان ہو یا میرپور خاص، ہمارے معاشرے میں ایسے کرداروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تن من نیل و نیل جیسے ڈرامے کے آئینے میں اپنا عکس تلاش کریں اور اپنی اصلاح کا سلسلہ فی الفور شروع کر دیں۔

مرتب: وجیہہ حسان واحدی

نامے جو میرے نام آئے!

یہ قارئین کے برقی خطوط اور پیغامات ہیں جو انھوں نے ہمیں ارسال کیے۔
قارئین و سامعین اس پتے پر اپنی آراء، تجاویز اور تحریریں اس برقی پتے پر بھیج
سکتے ہیں: آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی بھیج سکتے ہیں۔

Salihaat@almawridus.org

عظمیٰ

سنگاپور سے عظمیٰ لکھتی ہیں کہ "عدت اور اس کے مسائل" بہت اچھی طرح سے پیش کیا گیا مضمون ہے۔ ایک پیچیدہ موضوع کے بارے میں سادہ الفاظ میں مکمل وضاحت کی گئی ہے۔ عدت کو اکثر غلط سمجھا جاتا ہے اور غلط فہمیاں اکثر متعلقہ خواتین کے لیے پریشانی کا باعث بنتی ہیں۔ اس آرٹیکل میں دیا گیا پس منظر اور استدلال عورتوں اور مردوں کے حقوق کی واضح تفہیم فراہم کرتا ہے، وہ بھی ایک ایسے نازک اور مشکل وقت میں جب تعلقات کے خاتمے کی صورت بن چکی ہو۔ اس مشکل وقت میں معاملات کیسے چلانے ہیں جو دونوں کے لیے ہمدردی بھی رکھیں اور باوقار بھی ہوں۔

فوزیہ نورین

بچوں کی تربیت کے چند اہم پہلو کے بارے میں فوزیہ نورین اسلام آباد سے لکھتی ہیں کہ اس تحریر میں مصنفہ ثوبیہ نے کچھ اہم نکات کی طرف توجہ دلائی ہے، لیکن والدین جس فریم ورک میں کھڑے ہیں اس سے اوپر اٹھ کر دیکھنا یا سوچنا ان کے لیے ممکن نہیں۔ لہٰذا مسائل میں گھرے والدین کے لیے ان نکات پر اس طرح غور کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ہاں اگر وہ اس طوفان سے کچھ دیر کے لیے نکلیں تو بہتر طور پر چیزوں کو ایک الگ زاویے سے دیکھ سکیں گے۔ نئے والدین جو ابھی پیچیدہ مسائل کا شکار نہیں بنے ہیں، انھیں اپنی اولاد کو فکری اور عملی آزادی دینے کا سوچنا چاہیے، بچوں کو ذاتی ٹرائل اینڈ ایرر سے خود سیکھنے کا سوچنا چاہیے، ان کو اپنے عملی نتائج کا سامنا خود کرنے دینا چاہیے۔

اسماء عباسی

شہر اسلام آباد سے اسماء عباسی مصنفہ ثوبیہ کی تحریر "بچوں کی تربیت کے چند اہم پہلو" کو پسند کرتے ہوئے درخواست کرتی ہیں کہ اگر آپ مندرجہ ذیل عنوانات کو بھی موضوع گفتگو بنا سکیں تو بہت اچھا ہو گا:

ماں باپ کے آپس کے رشتے کی کمزوری بچوں پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے؟

کیا بیٹوں اور بیٹیوں کی تربیت میں کچھ بنیادی فرق ملحوظ خاطر رکھیں؟

اولاد کا ماں اور باپ دونوں سے براہ راست تعلق کو پن پنا کتنا ضروری ہے؟

آج کے والدین کل کے گرینڈ پیرنٹس ہونگے

It takes a village to raise a child

کی روشنی میں آج کے والدین کو کل کے لیے خود کو کیسے تیار کرنا چاہیے؟

تسلیم زہرہ

تسلیم زہرہ شہر سرائے عالمگیر سے "بچوں کی تربیت کے چند اہم پہلو" پر لکھتی ہیں کہ ان کے ذہن میں کئی سوالات ہیں

بچوں کے سامنے اپنے جزبات اور رویوں کو والدین کیسے قابو میں کریں؟

اگر والدین کو کچھ نفسیاتی مسائل ہوں تو اپنے گھر میں موجود اپنے بچوں کو نفسیاتی مسائل میں مبتلا ہونے سے کیسے بچایا جائے؟

جیسا ہمارے ارد گرد کا ماحول ہے اس میں بچوں کو بد تمیز بننے سے کیسے بچایا جائے کہ ان کے دل میں ان کے بڑوں کی عزّت پیدا ہو؟

اپنے بچوں کے دلوں میں اپنا رعب بغیر مار کے کیسے پیدا کیا جائے؟ کیا رعب پیدا کرنا صحیح بھی ہے؟

اپنے بچوں کے دلوں میں ہمارے/اپنے لیے بھروسہ کیسے بڑھایا جائے؟

٦) میری بیٹی بڑی ہو رہی ہے۔اس پہ اپنا اچھا اثر کیسے ڈالوں کہ جب وہ ضد کرے تو وہ میری بات سمجھ پائے۔مانے بھی کیوں!؟آج کل کی اولاد کا لگتا ہے کہ اپنی ضد میں کسی کی بھی نہیں سنتے! کبھی کبھی تو قابو ہی میں نہیں آتے۔

کلثوم ثاقب

امریکہ سے کلثوم ثاقب لکھتی ہیں کہ جنوری تا مارچ کے صالحات میں زرخیز معلومات سے مزین خوبصورت مضامین پڑھنے کو ملے۔ویسے تو تمام مضامین ہی پڑھ کے علم میں اضافہ ہوتا ہے مگر ثوبیہ نورین کے مضمون "بچوں کی تربیت کے چند اہم پہلو" کو پڑھنا شروع کیا تو دل چاہ رہا تھا کہ یہ کبھی ختم نہ ہو۔اس بہترین مکالماتی انداز میں لکھے ہوئے مضمون میں بتایا گیا ہے کہ کیسے ہم والدین کی حیثیت کو کوئی بڑی چیز سمجھتے ہی نہیں اور اگر ذمہ داری سمجھتے بھی ہیں تو بس اس حد تک کہ ہم والدین کما کہ کھلائیں، ان کی خواہشات پوری کریں اور جہاں تک انکی تربیت کا سوال ہے وہ اسکول اور مسجد خود ہی کر دینگے۔تربیت کا پہلا مرحلہ والدین کا عمل اور کردار ہوتا ہے، اگر والدین صرف اپنے دور کی مثالیں دے کر اولاد کو بیزار کرتے رہے تو اسکا انجام بھیانک نکلے گا۔بچوں کو کم عقل یا نالائق سمجھنا، انکو بے جا لاڈ پیار کرنا یا حد سے زیادہ سختی کرنا، ایسے جیسے وہ اولاد نہیں، جاگیر ہوں۔ہم چاہتے ہیں کہ ہم کو نہ تربیت کرنی پڑے اور نہ ہی محنت، بس اولاد خود سے سب کچھ سیکھ لے اور بڑی ہو جائے۔ہم اپنے سوشل میڈیا اور دیگر تفریحات کی قربانی اولاد کے لیے نہیں دینا چاہتے اور نہ ہی انکے ساتھ بیٹھ کے انکی اچھی، بری، چھوٹی، بڑی، نا سمجھی کی باتیں سننے کی زحمت کرتے ہیں۔اس کے باوجود اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد کو اچھی طرح جانتے ہیں۔لیکن اس دن سے ڈرنا چاہیئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہماری آنکھ کھلے تو بہت دیر ہو چکی ہو۔

فوزیہ رضی

لائبریری کی پائیدار اہمیت "پر فوزیہ رضی سنگاپور سے لکھتی ہیں کہ میں پین تالیس سال کی عمر میں ان لوگوں میں شامل ہوں جنھوں نے موبائل سے کچھ زیادہ ہی دوستی کرلی ہے اور گوگل جی کے ہاتھ پر بیعت! لیکن اس آرٹیکل نے میری سوچ اور سمجھ میں بہت اضافہ کیا۔ لائبریری کی اہمیت اور سوسائٹی میں ضرورت، اس کے ان گنت فوائد پڑھ کر مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وقت کے ساتھ بدلنے کا مطلب یہ نہیں کہ پرانے طریقے غلط ہیں بلکہ کو ایگزسٹ کرکے، آج کی لائبریری کو اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کا حصہ بنا کر بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل سکتا ہے۔

ثوبیہ نورین

"لائبریری کی پائیدار اہمیت "پر ثوبیہ لاہور سے لکھتی ہیں: بہت ہی اچھا اور انفرمیٹ یوٹاپک ہے۔ اس آرٹیکل نے میرے بچپن کی بہت سے یادیں تازہ کیں جو ہمارے شہر اور اسکول کی لائبریری سے وابستہ ہیں۔ لائبریرین کی اہمیت والا پوائنٹ بہت ہے کمال کا تھا!

عائشہ اسد

"الوبرائے فروخت نہیں "پر تبصرہ پڑھ کر عائشہ اسد لاہور سے لکھتی ہیں: بہت اچھا تبصرہ پیش کیا ہے آپ نے۔ ماشاءاللہ۔ سن کے رونا آگیا! اب تو یہ ڈارمہ دیکھنا ہی پڑے گا!

آمنہ رزاق

آمنہ رزاق واہ کنٹ سے لکھتی ہیں: بہت خوب ثوبیہ! ماشاءاللہ۔ آپ کی سوچ، سمجھ اور فہم میں اللہ برکت فرمائے۔ آپ کا تبصرہ پڑھ کر دل چاہ رہا ہے کہ یہ ڈرامہ ضرور دیکھوں۔

نزہت فاطمہ

نزہت فاطمہ بحرین سے علیزے نجف کا مضمون "خود مختاری: مرد و زن کا مشترکہ حق" کے لیے لکھتی ہیں کہ یہ بہت متاثر کن اور دلنشیں تحریر ہے۔ اس انتہائی اہم اور حساس موضوع کو پڑھنے کے بعد امید ہے کہ یہ مضمون

تاثرات

لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے درد دل رکھنے والے لوگ دنیا میں موجود ہیں پھر بھی بہت بڑی تعداد میں خواتین کے ساتھ ناانصافی ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ عورتوں پر مظالم اور پیش آنے والے مسائل ہم روز خبروں میں دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، لیکن معاشرے نے جیسے اس کی طرف سے آنکھیں موند لی ہوں۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کے حقوق کا جو استحصال ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اکثر گھرانوں میں خواتین خواہ ۲۵ سال کی ہوں یا ۵۰، ۶۰ سال کی، مگر اپنے گھر میں بھی اپنی آزادیِ رائے کے حق کو استعمال نہیں کر پاتیں۔ ان کو مردوں کے حکم کا پابند بنایا جاتا ہے۔ ان کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنا ہمارے معاشرے کے لیے بالکل اجنبی شے ہے۔ یہ بات بھی غورِ طلب ہے کہ لڑکیوں اور خواتین پر ہونے والے مظالم میں خود خواتین بھی شامل ہوتی ہیں۔ انہی خواتین کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں تربیت اس نہج پر ہوتی ہے کہ لڑکے امرانہ ذہن کے مالک بن جاتے ہیں اور لڑکیوں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جاتی ہے کہ ان کو سمجھوتہ ہی کرنا ہے خواہ ان کے ساتھ زیادتی ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ لڑکیوں کے حقوق جو اسلام نے دیے ہیں اس سے صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے۔ یا تو خواتین اپنے حقوق کے بارے میں ناآشنا ہیں یا پھر انھیں بھول جانے پر مجبور۔ ہمارے معاشرے میں یہ بات معیوب سمجھی جاتی ہے کہ لڑکیاں اپنے حقوق کے بارے میں لب کشائی کریں۔

میں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گی کہ لڑکوں کی تربیت اپنے گھروں میں اس طرح سے ہوتی ہے کہ جب وہ شوہر اور باپ بنتے ہیں تو ان کا مزاج اپنے گھر کے ماحول اور تربیت کی وجہ سے امرانہ ہو چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ جو فیصلہ کریں، بلا چوں چراں، بیوی اور بچوں کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوتا ہے۔ اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ اولاد کو اپنی مرضی اور رجحان کے مطابق تعلیم کا یا اپنے پروفیشن کو چننے کا حق نہیں دیا جاتا، والد صاحب جو فیصلہ کریں اسی حکم کو بجالانا ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں لڑکے اور لڑکیاں اپنی مرضی سے اپنی تعلیم اور کریئر کا انتخاب نہیں کر سکتے پھر اس کا اثر ان کی پوری زندگی پر پڑتا ہے۔

بہرحال یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ڈیجیٹل دنیا نے ایک ایسے انقلاب کی راہ ہموار کر دی ہے کہ جس کا دائرہ وقت کے ساتھ بڑھتا ہی جائے گا اسی طرح معاشرے میں اور بالخصوص خواتین میں آگہی پیدا ہوگی اور اعتماد میں اضافہ ہوگا۔

قران کریم میں ارشاد باری تعالی ہے کہ "مرد ہو یا عورت، میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا کوئی عمل ضائع نہیں کروں گا تم سب آپس میں ایک ہی ہو۔" یعنی ایک جیسے ہو۔

مذہب کی تعلیمات کے لیے قران کریم کو سمجھ کر پڑھنااور اپنے بچوں کو بھی اس کی ترغیب دینااز حد ضروری ہے! روزانہ چند آیات ہی صحیح، ترجمے کے ساتھ پڑھیں، غور کریں اور عمل کے لیے اصول لیں- والدین اپنی اولاد کی تربیت میں خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، فرق نہ کریں۔ دونوں کو مکمل تعلیم فراہم کریں۔ دونوں کو آج کی دنیا میں خود مختاری کی اہمیت کا احساس دلائیں۔

آخر میں صالحات کے پلیٹ فارم پر میں والدین سے یہ گزارش کرناچاہوں گی کہ اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی ایسی تربیت کریں کہ وہ اچھے انسان اور مہربان والدین بنیں-اس سلسلے میں المورد میں ایک کورس بھی چل رہا ہے کانشس پیرنٹنگ جس کو جوائن کر کے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔والدین کو چاہیے کہ اپنی کمزوریوں کا خود جائزہ لیں اور ان کو دور کرنے کی کوشش کریں-اپنے دینی و دنیاوی مطالعے کو وسیع کریں تاکہ تنگ نظری اور فرسودہ روایات اور خیالات سے دامن چھڑا سکیں۔

نادرہ زیدی

کراچی سے نادرہ زیدی لکھتی ہیں کہ لائبریری کی پائیدار اہمیت کا آرٹیکل کو سن کر دل خوش ہو گیا۔مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہمارے نانانانی اور امی مجھے اور میرے بھائی کو لائبریری لے جاتے تھے، وہاں سے ہم اپنی پسند کی کتابیں لیتے اور امی سی مختلف کتابوں اور مصنفوں کی کتابوں کی اہمیت سنتے۔ ہمیں کتابوں سے دلی محبت سکھائی گئی۔ یہ بھی بتایا گیا کہ پہلے فکشن پڑھو،اس سے کریئیٹیو تھنکنگ اچھی ہو گی، کہانیوں کے مختلف کرداروں کے اندر اپنا آپ نظر آئے گا۔اور پھر نان فکشن پڑھو۔ جس سے دنیا کے علم کے بارے میں اضافہ ہو گا۔ چاہے وہ تاریخ پر مبنی ہو یا کسی کی سوانح حیات پر۔اس تحریر میں مصر میں الیگزینڈر کی لائبریری کی تاریخ پڑھ کر اچھا لگا۔ میں مصر کی ایک قدیم لائبریری میں گئی تھی اور اس کے سامنے کی دیوار پر ہر زبان کا ایک لفظ لکھا ہوا ہے۔اس یاددہانی کا بہت شکریہ! والدین کے لیے بہت ضروری ہے کے وہ اپنی اولاد میں لائبریری جانے کی اہمیت اپنے عمل سے ڈالیں۔ کہانیوں کو پڑھنا بہت کچھ سکھاتا ہے۔ ذہن کو مضبوط بناتا ہے۔ زبان کی فراوانی بڑھاتا ہے۔ لکھنا سکھاتا ہے۔اس تحریر میں کامکس کی اہمیت کے بارے میں پڑھا، بہت خوب۔ بہت ضروری پوائنٹ ہے! اکثر لوگ اس کے بارے میں غلط رائے رکھتے ہیں۔ تحریر اور آڈیو دونو بہت اچھی کاوشیں ہیں۔

تاثرات

عظمیٰ حسن

سنگاپور سے عظمیٰ حسن لکھتی ہیں کہ اُمّ موسیٰ ایک بہت پُر اثر تحریر ہے۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور پڑھا جا چکا ہے۔ لیکن دو باتیں یہاں مختلف ہیں۔

پہلی بات، وہ تاریخی پس منظر جس کی وجہ سے بنی اسرائیل اس مصیبت میں تھے اور دوسرا وہ زاویہ جس سے اس کہانی کو لکھا گیا

ان کی والدہ کے نقطہ نظر سے ان کی کہانی کو پڑھ کر ایک مختلف آگاہی ملی۔ اس ماں کے جذبات اور احساسات کیا ہوں گے جس کی اولاد خطرے میں ہو۔ اس ماں کے ایمان کا کیا ہی معیار ہو گا جو اپنے لخت جگر کو اللہ کے حوالے کر دے۔ اور اس رب کی محبت اپنے بندے کے لیے! کس خوبصورتی سے اللہ نے وسیلے پیدا کیے اور اپنے بندے کی دعا کو قبول فرمایا۔ کس قدر خوبصورت اللہ اور بندے کا رشتہ ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر ہم اپنا ایمان اور توکل مضبوط کر لیں تو اس کے اثرات ہماری زندگی پر کیا ہوں گے! ہمارے کتنے مسائل اور مستقبل کا خوف دور ہو گا جو ہمیں اور ہماری سوچ کو مفلوج کر دیتا ہے۔ شاید ہمیں اس سے آزادی مل سکے۔